عدد ۴	ماہ رجب المرجب سنہ ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء	جلد ۴۰

مضامین

شذرات

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک کی موجودہ فضا ایک مشترک دیسی زبان کے لیے جس کا پسندیدہ نام ہندوستانی پڑ رہا ہے، بہت سازگار ہو رہی ہے، ڈاکٹر تاراچند اور پنڈت جواہر لال کے محققانہ مضمون نے جو بہت سوچ سمجھ کر لکھے گئے ہین، غلط فہمیون کے تہ بہ تہ پردون کو چاک کردیا ہی، ہمارے صوبہ کی اسمبلی مین ہمبئی کی زبان پر جو تقریرین ہوئین اُن سے اچھی طرح پتہ لگتا ہے کہ ہوا کا رُخ کدھر ہے، افسوس ہوگا اگر زبانی ملاپ کے لئے ہم ہندو مسلمان اس موقع سے فائدہ نہ اٹھائین،

ہماری زبان کے نوشق اخبار نویسون اور مضمون نگارون مین اپنی قابلیت کی زبی دھاک بٹھانے کے لئے عربی اور فارسی کے موٹے موٹے لفظون کا شوق ترقی پر ہے، ان مین سے بعض بعض تو ایسے مین جو ان لفظون کے صحیح معنی بھی نہین جانتے، آپ سنکر ہنسین گے کہ دلی کے ایک عربی کے عالم اڈیٹر نے ایک زندہ انسان کی حد سے بڑھ کر تعریف کرتے کرتے "فقید المشرق" لکھدیا، اور وہ سمجھے کہ ہم نے مبالغہ کی حد کردی، اور شاید وہ اس کے معنی یہ سمجھے ہون کہ مشرق کی زمین مین اس کی مثال نہین، مگر اُس غریب کو یہ معلوم نہین کہ یہ کسی زندہ کی تعریف مین نہین، بلکہ مردہ کی تعریف مین استعمال کیا جاتا ہے، اور جس کا مطلب یہ ہے کہ "جو مشرق کے ہاتھ سے جاتا رہا"

کئی سال ہوئے کہ دو عربی کے عالم اڈیٹرون مین "جالیہ" کے لفظ کے ہندوستانی ترجمہ پر دو دو باتین اخبارون مین پڑھی تھین، حالانکہ ان دو مین سے کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس کے نئے معنی "نو آبادی" کے ہین یعنی جو لوگ اپنا اصلی وطن چھوڑ کر دوسرے ملک مین جا بسین،

ابھی حال کے اخبارون مین مصر کے شاہ فاروق کی ملکہ فریدہ خانم کے بے پردہ نکلنے کا ذکر آتا رہا ہے، اس خبر کی سرخی یہ لکھی جاتی رہی "ملکہ فریدہ نقاب برداشتہ رہین گی" نقاب برداشتہ شاید آج فارسی مین بھی نہ بولتے ہون، کیا اس کو ہم اپنی زبان مین یون نہین کہہ سکتے کہ ملکہ فریدہ پردہ نہین کرینگی، یا ملکہ فریدہ بے نقاب رہینگی،

عربی اخبارون کے ذریعہ نئی باتون کے لئے نئے عربی لفظ بڑی آسانی سے ہم اس لئے قبول کر لیتے ہین کہ ہم اپنے دماغ پر اپنی زبان کے لئے نئے لفظ بنانے کے لئے زور ڈالنا نہین چاہتے، آجکل فلسطین کے لگاؤ سے انتداب فلسطین بے تکلف ہمارے اخبار لکھ رہے ہین، مگر انھین کیا معلوم کہ ہندو تو ہندو، اچھے خاصے مسلمان بھی اس لفظ کے معنی نہین جانتے، ہمارے ہان سید جالب مرحوم نے حکم برادری کا لفظ اس کے لئے چلایا تھا، اور وہ چل نکلا تھا کہ انتداب نے آکر اُس کا خاتمہ کردیا،

آج ہماری زبان کا بناؤ اور بگاڑ ہمارے اہلِ قلم کے اور ان مین بھی سب سے زیادہ ہمارے اخبارون کے اڈیٹرون کے ہاتھون مین ہے، وہ اپنے روزانہ اور ہفتہ وار لٹریچر کے ذریعہ بہتون کو بنا یا بگاڑ سکتے ہین، وہ زبان کی مملکت کے بادشاہ ہین، اُن کے بننے سے سب بن سکتے ہین اور اُن کے بگڑنے سے سب بگڑ سکتے ہین، یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مقصد کسی پر اعتراض نہین، بلکہ ایک عام غلط رجحان کے خلاف دوستون کو یاد دہانی ہے،

ہمارے اخبار نویسون کا ایک عام رجحان یہ ہے کہ جب وہ انشا پردازی کا زور اور کسی مقصد کی اہمیت کا اظہار کرنا چاہتے ہین تو موٹے موٹے لفظون کی ہیبت اور بڑی بڑی ترکیبون کی عظمت سے ہم کو مرعوب کرنا چاہتے ہین، حالانکہ انشا پردازی کا کمال ان مین نہین، بلکہ اس مین ہے کہ وہ اپنے مطلب کو خوبصورتی کے ساتھ کتنے وسیع رقبہ تک پہنچا، اور کتنی بڑی تعداد کو سمجھا سکتے ہین، ہمارے اخبارون کی سرخیان اکثر ایسی ہوتی ہین جن کے معنی تا ہوس

اور برہان قاطع دیکھے بغیر سمجھ مین نہین آسکتے مبعوثین، مندوبین، زعیم، بطل حریت، قہرمان سیاست، سیاس، معدنِ زغال، حزب العمال کو کتنے اردو جاننے والے سمجھ سکتے ہین،

ہمارے خیال مین اخبار نویسون کی زبان کا بہترین نمونہ مولوی وحید الدین سلیم مرحوم (علی گڈہ انسٹیٹیوٹ گزٹ اور مسلم گزٹ لکھنؤ) اور سید جالب دہلوی مرحوم (ہمدم لکھنؤ) کی تحریرین ہین، ان لوگون نے بہت سے نئے لفظ بنائے، اور چلائے، نمایندہ کا لفظ مولوی وحید الدین سلیم مرحوم کا چلایا ہوا ہے، ماسٹر پیس کے لیے اختراع فائقہ وغیرہ کی جگہ شاہکار کا لفظ فارسی سے لیکر معارف نے چلایا، اور وہ چل گیا، کھرا سکہ وہی ہے جو بازار مین چل جائے، کھوٹے سکون سے کسی خزانہ کی دولت نہین بڑھ سکتی ہے،

یہ شبہہ نہ ہو کہ معارف کا دامن ان داغون سے پاک ہے، یاہم اپنے عیبون سے واقف نہین لیکن الہلال کا جادو جو برسون تک رہا، اب اتر رہا ہے، اور ہم خود اپنے کو اور اپنے رفیقون کو بھی ہشیار کر رہے ہین، اسی سلسلہ مین جی چاہا کہ اپنے ہم پیشہ دوسرے اہلِ قلم دوستون کو بھی ٹوکا جائے، گو یہ ہم کو معلوم ہے، کہ یہ کتنے خطرہ کی بات ہے، اور شیش محل مین بیٹھ کر دوسرون پر ڈھیلے پھینکنا احتیاط کے کس قدر خلاف ہے،

مقصد یہ ہے کہ اگر ہمارے اخبارون کو اپنے سیاسی اور اصلاحی خیالات عوام تک پہنچانا ہے، اور معمولی حرف پہچاننے والون کو بھی اخبار پڑھنے کی عادت ڈلوانا ہے تو ضروری ہے کہ وہ سطح سے نیچے اترین، اور قابلیت کے اظہار سے زیادہ فائدہ کا خیال کرین،

مقالات

صوفیانہ نظامِ اخلاق

از مولینا عبد السلام ندوی،

فضائلِ اخلاق کی دو قسمین ہین، ایک ایجابی اور دوسری سلبی، مثلاً امید و توقع جسکو حوصلہ مندی کے لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں، ایک ایجابی اخلاقی وصف ہے، جو انسان کو زندگی کی کشمکش میں آمادۂ عمل کرتا ہے، اس کے برخلاف زہد و تقشف ایک سلبی اخلاقی فضیلت ہے، جو انسان کے دائرۂ عمل کو محدود کر کے اُسکو پھٹے حال میں مسرور و شادماں رکھتی ہے،

فضائلِ اخلاق کی دو قسمیں اور بھی ہیں، ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی، مثلاً قناعت ایک انفرادی اخلاقی وصف ہے جو گوشۂ خلوت میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے، اس کے برعکس دیانت ایک اجتماعی خلق ہے، جسکی ضرورت زندگی کی نہایت اہم شاخ یعنی معاملات میں پڑتی ہے، صوفیہ کرام نے فضائلِ اخلاق کی ان مختلف قسموں میں سے صرف سلبی اور انفرادی اخلاق کو انتخاب کر لیا ہے، اور اسی بنا پر ابراہیم اطروش کہتے ہیں، کہ

"صوفی کا مشکیزہ اوسکی ہتھیلی، اس کا تکیہ اوس کا ہاتھ، اور اس کا خزانہ اس کا دل ہے"

(نفحات الانس)

ابراہیم ستنبہ ہروی کا قول ہے، کہ

جو شخص شرف کے اعلیٰ درجہ کو پہونچنا چاہتا ہے، اسکو سات چیزوں کے مقابلے میں سات

چیزوں کو اختیار کرنا چاہئے یعنی احتیاج کو دولت مندی پر، بھوک کو شکم سیری پر، پستی کو بلندی،
ذلت کو عزت، خاکساری کو غرور، غم کو خوشی اور موت کو زندگی کے مقابلے میں (نفحات الانس)

موجودہ دور کے ایک مصنف کے نزدیک امام غزالی نے احیاء العلوم میں انہی سلبی فضائل یعنی فقر، زہد، توکل، خوف، گمنامی، تواضع اور گرسنگی سے زیادہ تر بحث کی ہے، ایجابی اخلاق مثلاً جرات وشجاعت جو انسان کو اپنے مال وجائداد کی حفاظت اور غیر متوقع چیزوں کے حاصل کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، اون کے دائرۂ بحث سے خارج ہیں،

اسی طرح وہ انفرادی فضائل پر زیادہ زور دیتے ہیں، گویا وہ اخلاقی کتابیں اون لوگوں کیلئے لکھتے ہیں، جو عزلت گزینی اور خلوت نشینی کی زندگی بسر کرتے ہیں، اسلئے انکی کتابوں سے ارباب سیاست یعنی وزراء وسفراء کو کوئی اخلاقی فائدہ نہیں پہونچ سکتا، [۱]

اگرچہ قرآن وحدیث میں بھی اس قسم کے سلبی اور انفرادی اخلاق کے متعلق جستہ جستہ ہدایات موجود ہیں، تاہم اس بارے میں صوفیہ پر جو اعتراضات ہوسکتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں،

۱- قرآن وحدیث میں اس قسم کی جو اخلاقی ہدایات ہیں، ان کی لے کو صوفیہ کرام نے غیر فطری طور پر بہت زیادہ بڑھا دیا ہے، یعنی جس طرح ان کے ہر شعبۂ زندگی میں غلو پایا جاتا ہے، اسی طرح یہ غلو اس شعبہ میں بھی موجود ہے، اور اسلام میں غلو کی ممانعت ہے،

۲- اسلام نے اخلاقی حیثیت سے اجتماعی زندگی کو سلبی اور انفرادی زندگی پر ترجیح دی ہے، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جو مسلمان لوگوں سے میل جول پیدا کرتا ہے اور انکی پہونچائی ہوئی تکلیفوں کو سہ لیتا ہے، وہ اس مسلمان سے بہتر ہے جو لوگوں سے میل جول نہیں پیدا کرتا اور انکی پہنچائی ہوئی تکلیفوں کو نہیں سہتا، [۲] لیکن اس کے بخلاف صوفیہ کرام انفرادی اور سلبی زندگی کو اجتماعی زندگی

۱ الاخلاق عند الغزالی ص ۱۸۴ و ۱۸۵ ۲ ترمذی کتاب الزہد ص ۴۱۲،

پر ترجیح دیتے ہیں،

۳- ان سلبی اور انفرادی اوصاف کی بنیاد ضعف پر قائم ہے، لیکن اسلام قوت کا حامی ہے، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "طاقتور مسلمان کمزور مسلمان سے زیادہ خدا کے نزدیک بہتر اور محبوب ہے، جو چیز تمھارے لئے نفع بخش ہو، اس کی حرص کرو، خدا سے مدد مانگو، اور عاجز نہ ہو [۱]" لیکن صوفیہ کرام اسی ضعف کو انسان کی اصلی روحانی طاقت سمجھتے ہیں، اگرچہ ریاضات ومجاہدات میں صوفیہ کرام نے اسقدر مشقتیں برداشت کی ہیں، کہ طاقتور سے طاقتور آدمی بھی اونکو برداشت نہیں کرسکتا، لیکن یہ مصنوعی طاقت کی غلط نمایش تھی، ورنہ انھون نے عملی زندگی کی کشمکش میں کبھی عزم وثبات کا اظہار نہیں کیا ہے، بلکہ فسخ عزیمت انکا اخلاقی طغرائے امتیاز رہا ہے، اور اسی کے ذریعہ سے انھون نے خدا کو پہچانا ہے "عرفت ربی بفسخ العزائم" مشہور صوفیانہ فقرہ ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زبان سے نکل کر صوفیوں میں بہت مقبول ہوا ہے، اس بنا پر قدرتی آزمایشوں کے موقع پر وہ صبر وثبات کے ظاہر کرنے میں قاصر رہے ہیں، سمنون کا قول تو یہ تھا،

ولیس لی فی سواک حظ   فکیفما شئت فاختبرنی

اے خدا تیرے سوا میرے حصے میں کچھ نہیں، توجس طرح چاہے میری آزمایش کرے،

لیکن ایک روز جب وہ حبس بول کے عارضے میں مبتلا ہوئے، اور ان کا پیشاب بند ہوگیا تو سخت اضطراب اور بے صبری ظاہر کی، اور اس قدرتی آزمایش میں ثابت قدم نہ رہ سکے، قدرتی آزمایشوں پر یہ بے صبری ممکن ہے کہ قابل اغماض ہو، لیکن مذہبی آزمایشوں میں اس قسم کی مداہنت قابل اعتراض ہے، اور ہمارے صوفیہ سے اس قسم کی کمزوریاں سرزد ہوئی ہیں،

چنانچہ فتنۂ خلق قرآن میں جب امام احمد بن حنبل نے تمام مصائب کو خیر مقدم کہا، اور بشر بن حارث

۱ صحیح مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز الخ،

نے میدان سے قدم ہٹا کر گوشہ گیری اختیار کر لی، اور لوگون نے اسکی وجہ پوچھی تو بولے کہ امام حنبل پیغمبروں کے مقام میں کھڑے ہوئے ہیں، کیونکہ ان میں اسکی طاقت تھی اور مین اس طاقت سے محروم ہون[1]، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صوفیہ نے زیادہ تر وہی اجتماعی اخلاق اختیار کئے، جن کا تعلق ضعف کی تھا، مثلاً رحم، احسان، الفت و محبت وغیرہ یہی وجہ ہے کہ بہت سے صوفیہ جانوروں کے آزار دینے کا اجتناب کرتے تھے، یہان تک کہ موذی جانورون کو بھی نہیں ستاتے تھے، چنانچہ ملا عبد الرحمن جامی نفحات الانس میں لکھتے ہیں،

آمیر چہ سفال فروش کژدم از دکان برداشتے، و بہ پارہ بردے و آنجا گذاشتے شیخ الاسلام گفت کہ پدر من ہیچ جانور را نہ کشتے،

مردے را وقت خوش گشت، فرشتہ خود را دید، وے را گفت چہ باید کرد تا کہ شما را بہ بنید، گفت ہیچ جانور را نباید آزرد آن مرد ہیچ جانور را نمی، از رد فرشتہ را می دید، روزے مورچہ وے را بگزید، چیزے بروے زد مورچہ بیفتاد، پس ازاں ہرگز فرشتہ را ندید،[2]

خواجہ عثمان ہرونی کے ملفوظات میں ہے کہ

"ہر کہ دو مادہ گاؤ ذبح کند یک خون کردہ باشد، و ہر کہ چہار مادہ گاؤ ذبح کند، دو خون کردہ باشد، و ہر کہ دہ گوسفند ذبح کند یک خون کردہ باشد،[3]

یہ ایک صوفیانہ اخلاقی فضیلت تھی، جو اخیر زمانہ تک قائم تھی، چنانچہ مولینا غلام علی آزاد میر عبد الجلیل بن میر عبد الواحد کے فرزند اصغر سید اویس قدس سرہ کے حالات میں لکھتے ہیں:-

"اذیت ہیچ ذی روح نمی کرد، تا بجائے کہ موذی را نمی رنجانید و نوعے شیمۂ کریمہ ترحم داشت

---

[1] نفحات الانس تذکرہ بشر بن حارث، [2] نفحات الانس بحوالہ مآثر الکرام جلد اول ص ۲۱، [3] نفحات الانس بحوالہ مآثر الکرام جلد اول ص ۲۱،

کہ اگر فرد ورے را کار می فرمود وقت شدت حرارت موسم تابستان و صورت برودت ایام زمستان از مشقت عمل باز داشتہ در ظل عاطفت جا میداد و اجرت تمام و کمال تسلیم می نمود،[1]

سید محمود اکبر بلگرامی کے حال میں لکھتے ہیں،

و آں جناب در علم اسمار و تکسیر بے نظیر بود و جانور را نمی آزرد،[2]

مولوی غلام علی آزاد نے ان واقعات کے سلسلے میں لکھا ہے کہ یہ ابدال کا مذہب ہے جو جانورون کو نہیں ستاتے، لیکن ہمارے نزدیک اسکے لئے صوفیۂ کرام کو مذہب ابدال کے اختیار کرنے کی ضرورت نہ تھی، بلکہ بجز جواز خود صحیح حدیثون میں جانورون پر رحم کرنا ایک کار ثواب قرار دیا گیا ہے، اور صوفیہ نے اس معاملے میں حدیث ہی پر عمل کیا ہے، چنانچہ نفحات الانس میں لکھا ہے، کہ ابو شعیب مقنع نے ستر حج کئے تھے، اخیر حج کے لئے نکلے تو ایک کتے کو میدان میں دیکھا کہ پیاس کی شدت سے اسکی زبان منہ کے باہر نکل آئی ہے، یہ حالت دیکھ کر پکارے کہ کون ستر حج کو تھوڑے سے پانی کے عوض میں خریدتا ہے؟ یہ سن کر ایک آدمی نے ان کو تھوڑا سا پانی دیا، جسکو انھون نے کتے کو پلا دیا اور کہا کہ یہ میرے تمام حجوں سے بہتر ہے، کیونکہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ

فی کل ذات کبد حری اجر[3] — ہر جلے ہوئے سینے کے ٹھنڈا کرنے میں ثواب ہے،

لیکن با این ہمہ اسلام نے موذی جانوروں کو اس رحم سے مستثنیٰ کر دیا ہے، اس لئے ان پر رحم کرنا صوفیانہ غلو ہے، اس کے ساتھ رحم و ہمدردی اور الفت و محبت کے اظہار کے جو اجتماعی طریقے ہیں، وہ یہ ہیں،

۱- غلامون کی آزادی میں حصہ لینا، اور اس کے لئے جد و جہد کرنا،

۲- شفاخانے اور محتاج خانے کھولنا،

---

[1] مآثر الکرام جلد اول ص ۵۴، [2] ،، ص ۲۰، [3] نفحات الانس تذکرہ ابو شعیب مقنع،

۳۔ مریضوں کی دوا علاج، خدمت وتیمار داری، اور مُردوں کی تجہیز وتکفین کرنا،

۴۔ قتل وخونریزی اور لوٹ مار سے ملک کی حفاظت کرنا،

۵۔ زمانہ جنگ میں بادشاہوں کے درمیان مصالحت کرواکے ملک کو جنگ کے نقصانات سے بچانا،

۶۔ حکام کو ظلم وتشدد سے روکنا،

۷۔ مجرموں کو رہا کرانا،

۸۔ یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرنا،

۹۔ رفاہ عام کے چھوٹے چھوٹے کام کرنا، مثلاً بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا، غلط کاراڈمیوں کو کام کرنے کا صحیح طریقہ بتانا، بلا کرایہ کی کشتی یا سبیل چلانا، وغیرہ وغیرہ،

اور عیسائی مذہب جو اپنے زہد وتقشف کی وجہ سے صوفیانہ روش سے بہت زیادہ ملتا جلتا ہے، اس بارے میں ہمارے صوفیوں سے بازی لے گیا ہے، اور بہت سے پادریوں اور راہبوں نے جیسا کہ تاریخ اخلاق یورپ میں بہ تفصیل مذکور ہے، یہ تمام اخلاقی خدمتیں انجام دی ہیں لیکن ہمارے صوفیہ کی رحم وہمدردی میں اس قسم کی اخلاقی کوششوں کا کہیں سُراغ نہیں ملتا، کیونکہ جب کسی مذہب میں رہبانیت کا عنصر زیادہ شامل ہو جاتا ہے، تو اس کے پیرؤں سے اس قسم کے اخلاقی فضائل سلب ہو جاتے ہیں عیسائی پادریوں نے بھی اسی وقت یہ تمام خدمات انجام دی تھیں جب عیسائی مذہب رہبانیت کی غیر معمولی آمیزش سے پاک تھا ورنہ رہبانیت کے زمانہ عروج میں یہ تمام فضائل سلب ہو گئے، چنانچہ تاریخ اخلاق یورپ کا مصنف لکھتا ہے:-

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۹) بن ابی عثمان محمد بن ابراہیم خرگوشی ایک زہد پیشہ اور صوفی منش بزرگ تھے، انہوں نے نیشاپور میں ایک شفاخانہ کھولا تھا، اور اس پر بہت سے جائداد وقف کی تھی، اور غربا روفقرا پر اپنی تمام دولت صرف کرتے تھے، (معجم البلدان جلد ۳ صفحہ ۴۲۲)

"اخلاق کے جن شعبوں کا تعلق گداز ودرد اور راحت وہمدردی سے ہے، وہ تو گویا تمامتر مسیحی معیار اخلاق ہی کی تخلیق ہیں، قرون اولی میں مسیحیت کی یہ خصوصیت بدرجۂ اتم قائم رہی لیکن تیسری صدی سے جب کہ رہبانیت کا زور ہوا، اس میں کافی فرق پڑ گیا، اور اب اسکی توجہ دوسری چیزوں کی طرف بٹ چلی"[1]

غالباً ہمارے صوفیہ نے بھی رہبانیت اختیار کرکے اس قسم کے فضائل اخلاق کو ایک حدتک کھو دیا تھا، لیکن با ایں ہمہ ہمارے صوفیہ کے فضائل اخلاق کی فہرست اس قسم کے اجتماعی اوصاف سے بالکل خالی نہیں ہے، ایک خاص لفظ جو اس قسم کے تمامتر شریفانہ اوصاف کو شامل ہے، "فتوۃ" ہے اور اس کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ انسان ہمیشہ غیروں کے کام آتا رہے، لوگوں پر احسان کرے، کسی کو تکلیف نہ دے بلکہ خود لوگوں کی تکلیفوں کو برداشت کرے، ہمارے صوفیہ نے اس قسم کے مفہوم کو عملی جامہ پہنایا، اور اسی اصول کے مطابق اسلامی سوسائٹی میں "فتیان" کی ایک جماعت قائم ہو گئی جو اس زمانے میں سیلوا یشمتی اور بوائے اسکاؤٹ سے بہت کچھ مشابہت رکھتی تھی، ابن بطوطہ نے اثنائے سیاحت میں اس جماعت کو دیکھا ہے، اور اپنے سفر نامے کے مختلف مقامات میں ان کے حالات لکھے ہیں، ایک موقع پر لکھتا ہے کہ "یہ لوگ رومی ترکمانی ملکوں کے ہر شہر اور گاؤں میں موجود ہیں اور ان سے زیادہ مسافروں کی خبرگیری کرنے والا، ان کو کھانا کھلانے والا، ان کی ضروریات کا پورا کرنے والا اور ظالموں کا ہاتھ پکڑنے والا دنیا میں کوئی نہیں ہے، مجرد نوجوان اپنے ایک ہم پیشہ شخص کو اپنا سردھرا بنا لیتے ہیں، جسکو یہ لوگ "اخی" یعنی اپنا بھائی کہتے ہیں، وہ ایک زاویہ بنا لیتا ہے اور اس میں فرش، چراغ اور ضروری ساز وسامان فراہم کر لیتا ہے، اور حصول معاش کے لئے دن میں اپنے رفقاء کو کام میں لگائے رکھتا ہے، اس طرح ان کو جو کچھ ملتا ہے، اسکو لیکر عصر کے بعد

[1] تاریخ اخلاق یورپ جلد دوم ص ۸۱،

اوس کے پاس آتے ہیں، اور اس سے میوہ اور کھانا وغیرہ جو زاویہ میں صرف کیا جاتا ہی، خریدتے ہیں اور جب اس شہر میں کوئی نووارد مسافر آجاتا ہے، تو اسکو اپنے یہاں اتارتے ہیں، اور اسکی مہمانداری کرتے ہیں، اور وہ اپنی واپسی کے زمانے تک انہی کے یہاں قیام کرتا ہے لیکن جب کوئی مسافر نہیں آتا تو خود کھانے پر جمع ہوتے ہیں، اور کھا پی کر گاتے ہیں، بجاتے ہیں، ناچتے ہیں، پھر صبح کے وقت اپنے کام پر چلے جاتے ہیں، اور عصر کے بعد اپنے سردار کے پاس پھر واپس آتے ہیں، ان لوگوں کو فتیان اور ان کے سردار کو اخی کہتے ہیں، میں نے دنیا میں ان سے زیادہ شریفانہ کام کرنے والا انسان نہیں دیکھا، شیرازیوں اور اصفہانیون کے شریفانہ کام بھی انہی لوگون سے مشابہت رکھتے ہیں لیکن یہ لوگ آنے جانے والے مسافروں کو زیادہ دوست رکھتے ہیں، اور ان کی بہت زیادہ عزت کرتے ہیں اور انکی حال پر بہت زیادہ شفقت کرتے ہیں،

اس شہر میں ہمارے پہنچنے کے دوسرے دن انہی فتیان میں سے ایک شخص شیخ شہاب الدین حموی کی خدمت میں آیا، اور ان سے ترکی زبان میں جسکو میں اسوقت نہیں سمجھتا تھا، گفتگو کی، وہ پرانے کپڑے پہنے ہوے تھا، اور اس کے سر پر ایک موٹے کپڑے کی ٹوپی تھی، مجھ سے شیخ نے کہا کہ تمھیں معلوم ہے کہ یہ کیا کہتا ہے؟ میں نے کہا مجھے معلوم نہیں، بولے تمھارے اور تمھارے رفقار کی مہمانی کرنا چاہتا ہے، میں نے اسکی دعوت کو قبول کرلیا، اور جب وہ پلٹا تو میں نے شیخ سے کہا کہ یہ ایک ضعیف آدمی ہے، ہماری مہمانی کی استطاعت نہیں رکھتا، اور ہم لوگ اسکو تکلیف دینا نہیں چاہتے، اس پر شیخ ہنسے، اور کہا کہ اخیتہ الفتیان کا ایک نہایت فیاض شیخ ہے، اور اس کے رفقار کی تعداد تقریباً دو سو ہے، جو سب کے سب پیشہ ور ہیں، اور سب نے اسکو اپنا سردار بنا لیا ہے، مہمانداری کے لئے ایک زاویہ قائم کیا ہے، دن کو جو کچھ کماتے ہیں، رات کو صرف کر دیتے ہیں، نماز مغرب کے بعد وہ شخص پھر ہمارے پاس آیا، اور ہم اس کے ساتھ اس کے زاویہ میں گئے، جس میں خوبصورت رومی قالین بچھے

ہوئے تھے، اور بہت سے عراقی شیشے کے جھاڑ لگے ہوئے تھے...... مجلس میں نوجوانوں کی ایک صف بستہ جماعت قبا پہنے ہوئے کھڑی تھی، اور ان کے پاؤں میں موزے تھے، اور ہر ایک آدمی پٹی لگائے ہوئے تھا، اور اس کی کمر میں دو ہاتھ کی لمبی چھری لگی ہوئی تھی، ان کے سر پر سفید اونی ٹوپی تھی، اور ہر ٹوپی کے اوپر کپڑے کا ایک ٹکڑا جو ایک ہاتھ دو انگل لمبا تھا، لگا ہوا تھا، جب یہ لوگ بیٹھ چکے تو ہر ایک نے اپنی اپنی ٹوپی اتار کر اپنے اپنے سامنے رکھدی، اور ان کے سروں پر ایک دوسری ٹوپی رہ گئی، جب ہم اطمینان کیساتھ بیٹھ چکے، تو یہ لوگ بہت سا کھانا میوہ اور مٹھائی لائے، پھر گانا اور ناچنا شروع کیا، ہم کو ان کی یہ حالت بہت پسند آئی، اور ان کی سماحت اور فیاضی پر ہم کو بڑا تعجب ہوا، اور ہم رات کے پچھلے پہر انکو ان کے زاویہ میں چھوڑ کر واپس آئے،[1]

ایک دوسرے موقع پر لکھتا ہے، کہ "فتیان کے یہان رسم یہ ہے کہ جاڑوں کے زمانے میں اپنے زاویے میں آگ روشن رکھتے ہیں، اس غرض سے زاویے کے ہر ستون کے پاس ایک ایک آتشدان بنائے رکھتے ہیں، اور اس کے لئے بہت سی چمنیاں بناتے ہیں، جس سے دھواں نکلتا رہتا ہے اور اسکو بخاری کہتے ہیں، ...... تو جب ہم اس زاویے میں پہنچے تو آگ روشن پائی اور میں نے اپنے کپڑے اتارے، اور آگ تاپی، اسکے بعد اس زاویے کا سردار کھانا میوہ، اور بہت سی چیزیں لایا، خدا اس جماعت کا بھلا کرے کہ وہ کسقدر فیاض طبع ہے، کسقدر ایثار کرتی ہے، اجنبیوں کے ساتھ کس شفقت سے اور مسافروں کے ساتھ کس قدر لطف ومحبت سے پیش آتی ہے، ایک مسافر جب ان کے یہان آتا ہے، تو گویا وہ اپنے محبوب ترین اہل وعیال کے یہاں آتا ہے،[2]

ایک اور موقع پر لکھتا ہے، کہ اس زاویے میں ایک بزرگ رہتے ہیں، جنکا نام ابوزید عبدالرحمن ہے، انکے ساتھ کچھ فقرار بھی رہتے ہیں، جن کی عادت یہ ہے کہ روزانہ نماز عصر کے بعد اس زاویہ میں

[1] ابن بطوطہ جلد اوّل ص ۲۱۴، ۲۱۵، [2] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد اول ص ۲۳۸،

جمع ہوتے ہین، پھر شہر کے ہر گھر کا چکر لگاتے ہین، اور ان کو ہر گھر سے دو ایک روٹیان ملتی ہیں، جس کو وہ آنے جانے والے مسافروں کو کھلاتے ہیں، یہاں کا ہر گھر اس کا خوگر ہوگیا ہے، اور اسکو اپنی معمولی ضرورت کی چیز سمجھتا ہے، اور کھانا کھلانے کی مد میں اس کو ایک قسم کی امانت قرار دیتا ہے،[1]

یہ جماعت جن فیاضیانہ اور شریفانہ اوصاف سے متصف ہوتی تھی، اس کا اندازہ اس حکایت سے ہو سکتا ہے، کہ ایک بار اس گروہ کے کچھ لوگ اس جماعت کے ایک آدمی کی ملاقات کو گئے، اس نے غلام کو دسترخوان بچھانے کا حکم دیا، لیکن تین بار کے متصل تقاضے کے بعد بھی جب اوس نے دسترخوان نہیں بچھایا، تو اس نے پوچھا کہ "دسترخوان کے بچھانے میں کیون دیر کی" اوس نے کہا کہ دسترخوان چیونٹیوں کے اوپر تھا، اور مہمانوں کے سامنے چیونٹیوں سمیت دسترخوان بچھانا ادب کے خلاف تھا، اور چیونٹیوں کو جھاڑ دینا اور ان کی روزی سے ان کو محروم کر دینا فتوت کے خلاف تھا، اسلئے میں ٹھہر گیا یہان تک کہ چیونٹیان چلی گیئن، اب سب نے کہا کہ "اے غلام تجھ سا ہی شخص ہم جیسے لوگوں کا خدمتگذار ہو سکتا ہے،[2]" اس جماعت کے علاوہ بہت سے صوفیہ ذاتی طور پر بھی مہمان نوازی کو بہت بڑی اخلاقی خدمت سمجھتے تھے، چنانچہ شیخ عمران شلتی ایک بزرگ تھے، جن کا قاعدہ تھا کہ جب تک کوئی مہمان نہ آتا دن کو کھانا نہ کھاتے، بلکہ روزہ رکھ لیتے،[3]

شاہ جلال شیرازی سکندر لودی کے زمانہ میں مکہ معظمہ سے ہندوستان میں آئے اور یہان قیام کیا، ان کی مہمان نوازی کا یہ حال تھا، کہ

اندرون دل کہ آمد آتش دیگدانش سرد نشد اکثر احوال نان و قرنی برائے مہمانان در خانہ او طیار بودے، ہروقت ہرکس کہ مہمان آمدے این طعام حاضر آوردے غیر طعامہائے دیگر کہ در وقت معین پختندے[4]

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد اول ص ۲۰۰، [2] مکۃ السالکین جلد دوم ص ۱۹۱ و ۱۹۲، [3] نفحات الانس تذکرہ عمران شلتی [4] اخبار الاخیار ص ۲۰۶

عہدِ اسلام کا پہلا کیمیا دان

از

جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی بی، ایس سی

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ عہدِ اسلام میں علمی کتابوں کے ترجموں کی بنیاد سب سے پہلے دوسرے عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے ڈالی لیکن علامہ شبلی کے الفاظ میں "منصور کے حق میں مورخین کی ایک بیجا فیاضی ہے، واقعہ یہ ہے کہ دولتِ بنی امیہ کے زمانہ میں بھی غیر زبانوں کے ترجمے ہوئے، امیر معاویہ کے دربار میں ابن آثال نامی ایک عیسائی طبیب تھا جس نے یونانی زبان کی بعض کتابیں ترجمہ کین،"[1]

ڈریپر معرکۂ مذہب و سائنس میں امیر معاویہ کے متعلق لکھتا ہے،

"انھوں نے اشتداد و تعصب کے سلاسل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، اور علوم و فنون کی سرپرستی شروع کر دی"[2]

تاریخی حیثیت سے عہدِ اسلام میں تراجم کا کام جب سے شروع ہوا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس کو مفید اور کار آمد بنانے والا امیر معاویہ کا پوتا خالد بن یزید تھا، جو "حکیم آلِ مروان" کے نام سے پکارا جاتا تھا،

ابن خلدون کی رائے، | خالد جہان اپنی زندگی میں تخت و تاج سے محروم رہا، وہاں مرنے کے بعد یہ اسکی انتہائی بدنصیبی تھی، کہ لوگ اس کو اس کی علمی کوششوں سے بھی محروم کرنے لگے، اور اس کے علمی کارناموں

[1] مقالات شبلی جلد ۳ ص ۴، [2] ترجمہ ظفر علی خان ۱۶۲،

کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا، اس تاریخی شک و شبہہ کی ابتدار اسلام کے نامور مورخ ابن خلدون سے ہوتی ہی، مقدمۂ تاریخ میں وہ لکھتا ہی:۔

ولا حوال فيهما لخالد بن يزيد بن معاوية ربيب مروان بن الحكم ومن المعلوم البين ان خالدا من الجيل العربي والبداوة اليه اقرب فهو بعيد عن العلوم والصنائع بالجملة فكيف له بصناعة غريبة المنحى مبنية على معرفة طبائع المركبات و أمزجتها وكتب الناظرين في ذلك من الطبيعيات والطب لم تظهر بعد ولم تترجم اللهم الا ان يكون خالد بن يزيد آخر من اهل المدارك الصناعية تشبه باسمه فممکن.[1]

مروان بن حکم کے آغوش پروردہ خالد ابن یزید بن معاویہ کے بھی کیمیا میں کچھ اقوال ہیں، لیکن معلوم ہے کہ خالد عربی دور میں تھا اور بدوپن کا زمانہ اس سے قریب تر تھا تو وہ علوم صنائع سے بیگانہ ہوگا، پھر وہ ایک بیگانہ فن جس کی بنار اشیار کے طبائع اور مزاجوں کی واقفیت پر ہے، کیسے واقف ہوگا، اس وقت تک اس فن کی کتابیں نہ شائع ہوئی تھیں، نہ ترجمہ ہوئی تھیں، ممکن ہے، کوئی اور خالد بن یزید ہو، جو کیمیا گر ہو اور جس سے اس کا نام مشابہ ہوگیا ہو،

یورپ کے مستشرقین نے ابن خلدون کی اس رائے کو بیحد اہمیت دے رکھی ہے، پہلے انھوں نے خالد بن یزید کی کیمیا دانی پر شک ظاہر کیا، اس کے بعد کھلے الفاظ میں وہ اس حقیقت سے انکار کرنے لگے، اور اب خالد کی کیمیا دانی الف لیلہ کی داستان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے،

[1] مقدمہ مطبوعہ بیروت، ص ۴۴۶ ۱۹۳۰ء

پروفیسر ڈاکٹر جولیس رسکا اپنے ایک تازہ مضمون میں لکھتے ہیں:۔

ہر وہ شخص جو تاریخی امکانات سے واقف ہے جانتا ہے کہ خلیفہ عبد الملک کے عہد میں ایک اموی شہزادہ، اپنے کو طب اور کیمیا میں مشغول رکھنے کا خیال بھی نہ لا سکتا تھا"[1]

مورخ ابن خلدون نے خالد کی کیمیا دانی سے انکار کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ بنی امیہ کے زمانے میں ایسی کتابوں کا ترجمہ تک شروع نہیں ہوا تھا، یہ بذاتِ خود ایک مستقل بحث ہے، جکی اس مضمون میں گنجایش نہیں،

ابنِ خلدون کے انکار کی ایک اور وجہ نظر آتی ہے، اوس نے علمِ کیمیا کو مہمل، لغو اور سحر و طلسمات کی قسم کا ایک علم قرار دیا ہے، چنانچہ اپنے مقدمہ میں لکھتا ہے:۔

"اس سے صاف ظاہر ہے، کہ کیمیا کوئی طبعی صنعت نہیں ہی، ...... کیمیا نفوسِ روحانیہ کے آثار و تصرف کے قبیل میں سے ہی، جس پر نیک لوگوں کو بطور کرامت، اور شریروں کو بطور سحر دسترس ہوتی ہے، رہی سحر کی تاثیر سو ساحر بھی قوتِ سحری سے اعیان مادی بدل دیتے ہیں، اور کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں"

یہی مورخ کیمیا کی تعریف یوں کرتا ہے:۔

"کیمیا وہ علم ہے، جو ایسے مادے سے بحث کرتا ہے، جس سے چاندی سونا بن سکے"

اوپر کی سطروں سے ظاہر ہے کہ ابنِ خلدون کے خیال میں اس علم (کیمیا) کا مقصد وہ تھا جس کا ہونا ناممکن اور عقل سے دور ہے، لیکن اگر یہ مورخ زیادہ تحقیق کی زحمت گوارا کرتا، تو اسے جابر بن حیان کی ایک تصنیف میں کیمیا کی تعریف یوں بھی نظر آتی "علم کیمیا فطری سائنس (Natural Science) کی وہ شاخ ہی جسمیں معدنیات کی اصل و نسل کے متعلق بحث کیجاتی ہی اور جسمیں اس کے خواص کا مطالعہ

[1] اسلامک کلچر (حیدرآباد) جلد ۱۱ نمبر ۱ ص ۳۶،

کیا جاتا ہے[1]؛

مقدمہ تاریخ میں علم کیمیا کے بیان میں ابی بکر بن بشرون کا ایک خط ابی السمح کے نام درج ہے، جس میں اس علم کے نقائص اور کمزوریاں دکھائی گئی ہیں، خالد کے علاوہ مسلمۃ المجریطی[2] صاحب "رتبۃ الحکیم" و "غایۃ الحکیم" اور جابر بن حیان کا نام کیمیا دانوں میں شمار کیا ہے، مگر جب علم کیمیا ہی لغو ٹھہرا تو پھر اس علم کے جاننے والوں کے متعلق تحقیق کی زحمت کیوں گوارا کی جاتی؟ ممکن ہے خالد کی کیمیا دانی سے انکار کی وجہ ابنِ خلدون کی یہی تحقیق کی کوتاہی ہو،

حالاتِ زندگی، ابو ہاشم خالد بن یزید بن معاویہ بن ابی سفیان ۴۹ھ/۶۵۲ء میں پیدا ہوا، یزید کے مرنے کے بعد معاویہ بن یزید خلیفہ مقرر ہوا، اس کی معزولی اور وفات کے بعد خلافت پر خالد کا حق تھا، لیکن سلطنت کی پیچیدگیوں نے اسے تخت و تاج سے محروم کر دیا، ایک جماعت خالد کی طرفدار تھی، مگر چونکہ خالد کی عمر سولہ (۱۶) برس کی تھی، اسلئے وہ لوگ اس کمسن لڑکے کو خلافت کے دعویدار کی حیثیت سے پیش کرنے میں ڈرتے تھے، عبید اللہ بن زیاد شام پہونچکر مروان بن الحکم کے لئے کوشاں ہوا، اخیر وقت میں اسے یزید کی طرف سے رنج پہنچا تھا، اسلئے اب وہ یزید کے خاندان میں خلافت دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا، مروان اس شرط پر خلیفہ مقرر ہوا، کہ اس کے بعد خلافت خالد کو دیدی جائے، اس نے خالد کی ماں سے شادی بھی کر لی، لیکن دس ماہ کے بعد خالد کی ماں کے ہاتھ سے قتل ہوا، کیونکہ اس نے اس کے خلاف اپنا ولیعہد، اپنے بیٹے عبد الملک کو نامزد کیا تھا، مروان کے مرنے کے بعد عبد الملک ہی خلیفہ مقرر ہوا، اسطرح خالد خلافت سے ہمیشہ کیلئے محروم رہ گیا[3]،

---

[1] (Chemistry to the time of Dalton (By e. j. holmyard) milford: 1925 p. 16

[2] ذاتی طور پر مسلمہ کی کیمیا دانی کے متعلق مشکوک ہوں "ش"، [3] تراجم تاریخ طبری جلد ۲ ص ۲۶۲، ابن اثیر جلد ۴ ص ۲۸۶ (حیدرآباد)

خالد بن یزید کا سب سے قدیم تذکرہ زبیر بن مصعب زبیری (مولود ۱۷۱ھ متوفی ۲۵۶ھ) کی کتاب میں ہے، جس کا حوالہ یاقوت نے معجم الادباء میں دیا ہے، غالباً یہ زبیری کی کتاب انساب قریش کا حوالہ ہے، زبیری کا بیان ہے،

"خالد علم سے موصوف تھا، اور حکیم اور شاعر تھا"

اس کے بعد ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) کا بیان ہے،

"خالد قریش میں علم کی مختلف شاخوں (فنون) کا سب سے بڑا عالم تھا[1]"

مورخ بلاذری (متوفی ۲۷۹ھ) نے انساب الاشراف میں جابجا اس کا نام لیا ہے،

مورخ طبری (م ۳۱۰ھ) نے لکھا ہے:-

"کہا جاتا ہے کہ خالد نے کیمیا کا راز پا لیا تھا[2]"

اس کا مفصل تذکرہ اصفہانی م ۳۵۶ھ نے اغانی میں کیا ہے[3] اس کے علاوہ اس کے تذکرے ابن ندیم[4]، صاعد اندلسی[5]، ابن خلکان[6]، ابن القفطی[7]، یاقوت رومی[8]، حاجی خلیفہ[9] وغیرہ نے کئے ہیں، ابن ندیم (موجود ۳۷۷ھ) لکھتا ہے "خالد بن یزید بن معاویہ ہی وہ تھا جس نے پہلے حکیموں کی کیمیا کی کتابوں کو پھیلایا، اور وہ پہلا شخص ہے، جس کے لئے طب، نجوم اور کیمیا کی کتابیں ترجمہ کی گئیں، اس کی کیمیا میں کئی کتابیں اور رسالے اور بہت سے اشعار ہیں، ابن ندیم کہتا ہے کہ میں نے اس کے پانچسو ورق کے قریب دیکھے ہیں، اور میں نے اس کی تصانیف میں سے یہ کتابیں دیکھی ہیں، کتاب الحرارات، کتاب الصحیفۃ الکبیر، کتاب الصحیفۃ الصغیر، اور اسی علم میں اس کا ایک وصیت نامہ اپنے بیٹے کے نام"

پھر ابن ندیم مسلمانوں میں علوم حکمیہ کے رواج کی تاریخ کے سلسلہ میں لکھتا ہے:-

---

[1] کتاب المعارف ابن قتیبہ ص ۱۵۳ مصر [2] طبری جلد ۲ ص ۲۹۴، لائیڈن، [3] کتاب الاغانی جلد ۱۶ ص ۸۸، [4] کتاب الفہرست (لپزگ) ص ۲۴۲ وغیرہ [5] ترجمہ طبقات الامم (اعظم گڈھ) ص ۲۰، [6] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۲۱۱، [7] تاریخ الحکما ص ۲۰۷، [8] معجم الادباء (گب میموریل سیریز) ج ۴ ص ۱۶۶، [9] کشف الظنون (لندن) ص ۲۰۶ جلد ۲

خالد بن یزید کو حکیم آلِ مروان کا لقب دیا گیا تھا، اسکو علوم و فنون سے محبت تھی، اسکو کیمیا کا خیال آیا، تو اوس نے ان یونانی حکیموں کو اپنے ہان بلوایا، جو مصر آیا کرتے تھے، اور عربی جانتے تھے، اور انکو یونانی اور قبطی سے عربی میں کیمیا کی کتابوں کے ترجمہ کا حکم دیا، اسلئے عہدِ اسلام میں یہ سب سے پہلا ترجمہ تھا، جو کہ دوسری زبانوں سے عربی میں منتقل کیا گیا[1]

اگر ابنِ خلدون اور اس کے ہمخیال یوروپین مستشرقین یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ کیمیائی تصنیفات کا ترجمہ خالد کے زمانہ تک نہیں ہوا تھا، تو انھیں یہ مان لینے میں کیا قباحت نظر آتی ہے، کہ تراجم کا آغاز خالد ہی کے زمانہ سے ہوا؟

آگے چل کر ابن ندیم لکھتا ہے "محمد بن اسحٰق کہتے ہیں، کہ اگلوں کے علوم و فنون کی کتابوں کے ساتھ جس شخص نے پہلے اعتنا اور ان کی قدر کی، وہ خالد بن یزید تھا، یہ خطیب، شاعر اور صائب الرائے شخص تھا"

محمد بن اسحاق کہتے ہیں، کہ "خالد بن یزید سب سے پہلا شخص تھا، جس نے علم طب نجوم اور کیمیا کی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا، یہ بہت ہی جری اور فیاض تھا"[2]

شاعری

خالد شاعر تھا، لیکن یہ کہنا دشوار ہے کہ اس کی شاعری میں حسن و عشق کا حصہ زیادہ تھا یا صنعت و حرفت کا، ابن خلکان لکھتا ہے:

ولہ فیہا اشعار کثیرۃ مطولات	اور اس میں اس نے بہت سے اشعار
ومقاطیع دالۃ علی حسن تصرفہ	کہے جو طویل بھی ہیں، اور مختصر بھی، اور جو اسکی
وسعۃ علمہ ولہ غیر ذلک	(شاعرانہ) قابلیت اور (کیمیائی) وسعت علم
اشعار جیدۃ،	کو ثابت کرتے ہیں، اس کے علاوہ بھی

(ابن خلکان جلد ۱ ص ۲۱۱)

۱ الفہرست ص ۲۴۲، ۲ الفہرست ص ۳۵۴،

اشعار ہیں، مثلاً:-

تجول خلاخیل النساء ولا اری	لرملۃ خلخالا یجول ولا قلبا

عورتوں کے پازیب جھنکارتے ہیں لیکن میں رملہ کے پازیب اور کڑوں کی جھنکار نہیں دیکھتا،

احب بنی العوام من اجل حبھا	ومن اجلھا احببت اخوالھا کلبا[1]

میں اس کی محبت کی وجہ سے بنی العوام اور اسکے ننہال والوں سے محبت کرتا ہوں،

طبقات الامم کا مصنف لکھتا ہے، "خالد بن یزید فن طب اور کیمیا کا عالم تھا، اس فن (کیمیا) میں اسکے کئی رسائل اور عمدہ اشعار ہیں، جو اس کے علم و فضل اور مہارتِ فن پر دلالت کرتے ہیں"[2]

اگر پروفیسر ہولمیارڈ کا خیال صحیح تسلیم کر لیا جائے تو خالد بن یزید کا مکمل دیوان قسطنطنیہ کے کسی کتبخانہ میں ابتک محفوظ ہے[3]

البیرونی نے بھی اس کے چند اشعار درج کئے ہیں، جن سے ایک درمیانی وقفہ کے اعداد نکلتے ہیں[4]

ابو القاسم العراقی آٹھویں صدی ہجری کے مشہور کیمیا دان نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف المکتسب فی زراعۃ الذہب[5] میں خالد کے اشعار درج کئے ہیں، پوری کتاب میں اشعار کی تعداد حسب ذیل ہے:

"قافیہ ق" کے ۱۱۲ اشعار، "قافیہ ء" کے ۱۱۲ اشعار "قافیہ د" کے ۱۲۹ اشعار"

یہ کل اشعار علم کیمیا سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں سے چند بطور نمونہ نقل کئے جاتے ہیں:-

۱ وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۲۱۱، ۲ طبقات الامم (اعظم گڈھ) ص ۴۳، فاضل مترجم حاشیہ میں ابن خلدون کی رائے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اسی بنا پر وہ (ابن خلدون) لکھتے ہیں کہ یہ خالد ایک دوسرے شخص کا نام ہے، جو عیسائی تھا، یہ صحیح نہیں، ابن خلدون نے لفظ عیسائی کا ذکر نہیں کیا ہے" ش، ۳ Jour. Soc. Chem. and Indus 1923, 4 Apr. 96، ۴ آثار الباقیہ ترجمہ سخاؤ ص ۲۳، ۵ شائع کردہ پروفیسر ای جے ہولمیارڈ پیرس ۱۹۲۳ء

یا باحثا عن صنعة البریاء	ودقیق ما صنعوا من الاشیاء
میز فدیتک ما اقول ولا تکن	کالجاهل الجوال فی عمیاء
حتی اذا ما کنت قد احکمتها	بالمزج عند العقد فی الابداء
وجعلتها من اربع معلومة	ارضین مع نار تشاب بماء
ما وزنها فی بدئها متساویة	فاذا جمعت فوزنها بسواء
وعقدتها عقدا بغیر ملالة	حتی تری کالشمعة الصفراء[1]

قافیہ "ق" میں

نحاسک بتیضه بماء الزرابق	تنل سعة فی الرزق من فضل رازق
وزاوج لطیف الماء ان کنت عالما	بلین هواء کامن فی المناطق
فهذا ابار القوم ان کنت جاهلا	به ونحاس ماؤه فی المهارق
وهذی هی الانثی التی جل ذکرها	وخصت بتزویج الغلام المراهق
یسمونها بالغرب فی رمز کتبهم	ویدعون لغزا بعلها بالمشارق
وهذا الذی اخفوه ثم تواقفوا	علی ستر ما فیه وکید المواثق
فزاوجه بالتعفین فی النار اربع	طبائع لا تخشی ملم الطوارق

(الی اخرہ[2])

نجوم۔ نجوم سے خالد کی دلچسپی اس کے ان اشعار سے ظاہر ہوتی ہے، جو البیرونی نے اپنی کتاب آثار الباقیہ میں نقل کئے ہیں، ان اشعار میں خالد نے حضرت آدم اور سکندر کے درمیان ۵۱۰۰ سال کا وقفہ بتایا ہے، بقول البیرونی یہ اعداد ۵۰۶۹ کے بہ نسبت اور دوسرے ماہرینِ فن کے نقطۂ نظر

[1] المکتب صہ ۳۹، [2] المکتب صہ ۳۴۔

ے زیادہ قابلِ اعتبار اور بہتر ہیں[1]،

البیرونی نے خالد کے اشعار بطور سند پیش کئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا پایہ نجوم میں کافی بلند تھا،

۴۳۵ھ میں ابن السندی مصر کے مشہور اصطرلاب اور دوسرے فلکی آلات سازنے قاہرہ کے کتب خانہ کو دیکھا تھا جس میں ۶۵۰۰ جلد کتابیں تھیں، اس کے علاوہ ایک تانبے کا کرہ تھا جس پر یہ عبارت کندہ تھی "یہ کرہ امیر خالد بن یزید بن معاویہ کے ہاں سے لایا گیا ہے" ابن السندی کا خیال ہے کہ یہ کرہ غالباً بطلیموس کا بنایا ہوا تھا[2]،

احکام نجوم میں خالد بن یزید تقریباً اہلِ عرب کا پیرو تھا[3]،

حدیث۔ مشہور محدث حافظ ابن حجر نے تہذیب میں اور یاقوت نے معجم میں لکھا ہے، کہ خالد نے حدیثیں بھی روایت کی ہیں، زہری، بیہقی، خطیب، بغدادی، عسکری، حافظ ابن عساکر وغیرہ نے اس کی سند پر حدیثیں روایت کی ہیں، ابن ابی حاتم نے بھی اسکو اپنی رجال میں جگہ دی ہے[4]،

خالد جمعہ، سنیچر اور اتوار کو روزے بھی رکھا کرتا تھا[5]،

عبدان نے خالد کا صحابہ میں ذکر کیا ہے، لیث بن سعد نے سعد بن ابی ہلال سے انھوں نے علی بن خالد سے روایت کی ہے، کہ ابو امامہ کا گذر خالد بن یزید بن معاویہ کی طرف ہوا، ابو امامہ نے خالد سے ایک حدیث پوچھی، جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی[6]، لیکن یہ سراسر غلط

[1] آثار الباقیہ صہ ۳، مترجم (سخاؤ) کا خیال ہے کہ عربی میں یہ عبارت وھو المشھور الخ سے بقی خمسة الاف وماۂتہ وثمانون تک بعد میں داخل کی گئی ہے، فاضل مترجم نے اپنے شبہ کی کوئی وجہ نہیں بتائی ہے، ممکن ہے ان پر بھی ابن خلدون کا اثر ہو، [2] ایضاً، [3] تاریخ الحکماء (القفطی) لیزگ صہ ۴۴، [4] طبقات الامم صہ ۱۱۳، [5] معجم الادبا جلد ۴ صہ ۱۶۵، [6] یاقوت جلد ۴ صہ ۱۹۱، [7] ترجمہ اسد الغابہ (ابن اثیر) جلد ۳ صہ ۱۳۳ (لکھنؤ)

ہے چونکہ خالد کی پیدائش ۴۹ھ میں ہوئی، اور آنحضرت صلعم کا وصال ۱۱ھ میں ہوا، اسلئے خالد کو آپ کی صحبت کا شرف کسی طرح حاصل نہیں ہو سکتا تھا،

درس و تدریس | خالد کے تقریباً کل سوانح نگار اس بات پر متفق ہیں، کہ خالد نے ایک رومی راہب مریانس نامی کے سامنے زانوے ادب تہ کیا، اور اس سے علم کیمیا سیکھا، استاد و شاگرد کے تعلقات، طرز تعلیم اور ان کے خیالات، لاطینی زبان کی ایک دلچسپ کتاب میں درج ہیں[1]، علم کیمیا پر یہ پہلی کتاب ہے جو عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوئی، اس کا مصنف مریانس ہے، اور مترجم بارہوین صدی عیسوی کا مشہور انگریز رابرٹ چسٹر ہے، جس نے سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا، برٹش میوزیم لندن میں اس کا نسخہ موجود ہے، میرے پاس انگریزی ترجمہ کے نسخہ کی نقل ہے[2]، ڈاکٹر رسکا کا خیال ہے کہ نہ تو یہ کتاب عربی میں تھی، نہ اسکا مصنف مریانس ہے، اور نہ اس کا ترجمہ رابرٹ چسٹر نے کیا ہے[3]، ہولمیارڈ یہ ضرور تسلیم کرتا ہے کہ مترجم رابرٹ چسٹر تھا، اور یہ بھی ممکن ہے کہ مریانس اور خالد کے مکالمہ میں (جو کتاب میں درج ہے،) خالد کے خیالات کو بھی دخل ہو لیکن اگر مریانس ہی ایک فرضی شخص ہے تو اس دعوی کا ثبوت مشکل ہے[4]،

یہ کتاب لاطینی زبان مین کئی بار[5] اور فرانسیسی ترجمہ کی صورت میں ایک بار چھپی[6]، پہلی بار ۱۷۰۲ء اور دوسری بار ۱۵۴۴ء میں شائع ہوئی[7]،

یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا ہے، کہ یہ کتاب کسی عربی تصنیف کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے لیکن

[1] (Liber de compostione alchemiac

[2] نسخہ نمبر ۲۲۹۶ برٹش میوزیم (Sloane. [3] Science progress Jan 1925

[4] کیمسٹری اینڈ انڈسٹری جرنل ۲۳ جنوری ۱۹۲۵ء [5] Magneto Bibl. Chem.—

[6] (Curiosa, i, 509; 1702 and paris 1546 [7] Bibliotheque de—

[8] عبارت خاتمہ نسخہ مذکور، [9] Philosophes chimiqui, 58. 1704

اس کے مطالعہ کے بعد یہ شک کرنا کہ اس کا ماخذ کوئی عربی تصنیف نہیں ہے، احتیاط اور دور اندیشی کی انتہا ہے،

اس کتاب کی بعض عبارتیں ایسی ہیں، جو صاف بتا رہی ہیں، کہ اسکی اصلی شکل عربی تھی، مثلاً العجل من الشیطان کا ترجمہ اس کتاب میں یوں ہے،:-

"....haistynesse is of ye (the) part of ye.
Divell (Devil)"

یا پھر یہ عبارت ملاحظہ ہو:-

"And there is noe (no) fortitude but wth.
(with) ye great God wch. (which) is one most
highest."

اس کتاب کے عربی سے ترجمہ یا ماخوذ ہونے کا دوسرا اہم ثبوت یہ ہے کہ اس کی بعض عبارتیں العراقی کی کتاب "المکتسب" میں تقریباً لفظ بہ لفظ پائی جاتی ہیں، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری تک عربی اصل موجود تھی، مندرجہ ذیل عبارت قابل غور ہے،:-

"...... قال نعم اذا احکمت علاج هذا الجسد فادخل علی ذلك من الخمیر ربع جزء واعلم ان خمیر الذهب ذهب وخمیر الخبز منه ولا یصلح الا به واجعل هذا الربع جزء من الخمیر الذهب ومن خمیر الخمیر ما یصلح به واحملهم علی الطبخ فی الشمس حتی اذا صار شیأً واحداً ......"[1]

انگریزی ترجمہ میں اسی عبارت کو ملاحظہ فرمائیے،

[1] المکتسب پیرس ص۱۴،

Morienus: It is so as you say. for when you have directed ye unclean body as hath been said. then put wth. it ye fourth part of ye ferment of it: for ye ferment of ☉ is ☉ as ye ferment of bread is breadwck. when you shall put into it put yt (that) in decockt in ☉ untill theis (these) two be brought into one body."

دوسری عبارت المکتب میں ہے:۔

قال مریانس لخالد بن یزید اما ما سالت عنہ من الاصل امن شیئ واحد امن اشیاء شتی فان ذلک شی واحد واصل جوھر واحد ونوع واحد منہ وبہ لا یزاد علیہ ولا ینقص منہ۔"[۲۹]

ترجمہ یہ ہے:۔

"Therefore yt wck. you heve demanded understand thus: There is one first and principall substance and matter of this thing and of it, nether is there anything

added unto it nor taken away from it."

ایسی عبارتیں اور بھی ہیں جنھیں ہم بخیال اختصار قلم انداز کرتے ہیں، اس مقابلہ کے بعد اس شک کا امکان باقی نہیں رہجاتا کہ یہ انگریزی کتاب جو لاطینی سے ترجمہ ہے، عربی سے ماخوذ نہیں ہے،

اب ایک سوال یہ ہے کہ یہ کتاب مریانس کی تصنیف ہو سکتی ہے یا نہیں؟

ایک سرسری مطالعہ کے بعد ہم کو اسے مریانس کی تصنیف مان لینے میں کوئی دقت نظر نہیں آتی ہے، مریانس اپنے کو ایک راہب ایدفر (Adfer) کا شاگرد بتاتا ہے، جسکی شہرت سنکر اس نے روم سے اسکندریہ تک سفر کیا، ایدفر کے انتقال کے بعد مریانس خالد کی شہرت سن کر اس کے دربار میں حاضر ہوتا ہے، اس کا خیال ہے، کہ خالد علوم و فنون کا سرپرست تھا، اور خود اکثر علوم میں مہارت رکھتا تھا، اس کے دربار میں معروف و غیر معروف فلسفیوں کا مجمع رہتا تھا، لیکن ان میں سے کوئی بھی اسے علم کیمیا کا درس نہ دے سکا، مریانس نے اسکی ذمہ داری لی، چنانچہ اس کے ایما سے ایک معمل (لیبوریٹری) تیار ہوا، جس میں مریانس نے اپنا کیمیائی عمل مکمل کیا، اس کے بعد خاموشی سے یہ لکھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا "جو اپنے ساتھ کل چیزیں رکھتے ہیں، ان کو دوسروں کی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی" خالد کو جب مریانس کے چلے جانے کا حال معلوم ہوا تو اسکو بیحد ملال ہوا، کیونکہ مریانس بغیر رموز سے آگاہ کئے ہوئے چلا گیا تھا، خالد نے اپنے وفادار غلام غالب کو اس کی تلاش میں بھیجا، غالب کامیاب ہوا، اور مریانس کو اپنے ساتھ واپس لایا، جس نے خالد کو کل کیمیائی عمل سے آگاہ کیا،

اس کتاب کا دلچسپ حصہ خالد اور مریانس کا مکالمہ ہے، جس کا اقتباس اوپر کے مقابلہ میں پیش کیا جا چکا ہے، ایک گہری نظر ڈالنے کے بعد اس میں بعض ایسی عبارتیں بھی نظر آتی ہیں، جن سے یہ شک پیدا ہوتا ہے، کہ یہ مریانس کی تصنیف نہیں ہو سکتی، مثلاً ایک جگہ مریانس کا یہ کہنا

And Gezid begott a sonne called Calid

who after ye death of his father raigned

a long tim in Egipt"

یہ سمجھنا دشوار معلوم ہوتا ہے، کہ مریانس، خالد کا استاد ہو کر اور عرصہ تک ساتھ رہکر یہ معلوم نہ کر سکا، کہ اس کا شاگرد، بادشاہ نہیں بلکہ محض ایک "شہزادے" کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس نے کبھی سلطنت نہیں کی،

یا پھر خالد کا مکالمہ میں یہ کہنا:-

"And I am ye nephew of Moyoa and ye son of Kinge Gezid"

ترجمہ:- "میں معاویہ کا بھتیجا اور یزید کا بیٹا ہوں"

واقعہ کے خلاف ہے، خالد امیر معاویہ کا پوتا، اور معاویہ بن یزید کا بھائی تھا،

ایسے جملے یقیناً ہمارے دلوں میں شک پیدا کرتے ہین، ممکن ہے کہ یہ لاطینی مترجم کی غلطیان ہوں، مگر ذاتی طور پر میرا یہ خیال ہے کہ غالباً یہ کتاب مریانس کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ اس کے کسی ہمعصر یا شناسا نے خود مریانس یا کسی دوسرے کی زبانی واقعات کو معلوم کر کے عربی میں یہ کتاب لکھدی ہے، اور اس کے ساتھ ہی اس کا بھی یقین ہے، کہ مصنف کوئی غیر مسلم عیسائی ہی تھا، چونکہ اس کا مواد مریانس سے حاصل کیا گیا تھا، اسلئے مؤلف نے اسکو مریانس ہی کے نام سے تصنیف کیا، قدماء کے زمانہ میں یہ عام دستور تھا کہ شاگرد اپنے استادون کے نام سے کتابیں لکھکر ان کی طرف منسوب کر دیتے تھے، اس لئے واقعات کی غلطی مریانس کی نہیں، بلکہ مؤلف کی ناواقفیت کا نتیجہ ہو سکتی ہے،

اتنا مسلم ہے، کہ اس ترجمہ (۱۱۴۴ء) کے تقریباً دو سو سال بعد تک اس کا عربی ماخذ موجود

تھا، العراقی کی کتاب المکتب تقریباً ۱۳۰۰ء کی تصنیف ہے، اور اس میں خالد اور مریانس کی گفتگو اس طرح درج ہے، جیسے اصل عربی کتاب سامنے رکھکر اس میں سے عبارتیں نقل کی گئی ہیں، جیسا کہ اس مقابلہ سے ظاہر ہے، ورنہ انگریزی ترجمہ اور عربی میں اس حد تک مطابقت ممکن نہ تھی،

خلیفہ عبد الملک اور خالد

یاقوت اور ابن خلکان نے لکھا ہے کہ خلیفہ وقت عبد الملک بن مروان اور خالد بن یزید کے تعلقات اچھے نہ تھے[1]، پھر بھی عبد الملک کے دربار میں خالد کی ایک خاص اہمیت تھی، جسکی وجہ اسکی شہزادگی نہیں تھی، بلکہ اسکا سبب خالد کا علم و فضل تھا،

خلیفہ عبد الملک کی طرف سے جو خطوط قیصر روم کے ہان جاتے تھے، ان کے شروع میں قل ھو اللہ احد اور آنحضرت صلعم کا اسم مبارک لکھا ہوتا تھا، قیصر روم کو یہ ناگوار معلوم ہوا، اس نے عبد الملک کو لکھ بھیجا، کہ یہ الفاظ نہ لکھے جائین، ورنہ ان کے سکوں پر ان کے پیغمبر کا تذکرہ ایسے الفاظ میں ہوگا جکو مسلمان پسند نہ کریں گے، اسوقت تک اسلامی حکومت میں رومی سکے رائج تھے، عبد الملک کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی، اس نے مشورہ کے لئے جس شخص کو طلب کیا وہ خالد بن یزید بن معاویہ تھا، خالد نے اس مسئلہ پر غور کر کے جواب دیا کہ بہتر ہے، کہ رومی سکون کا رواج چھوڑ کر اسلامی سکے ڈھلوائے جائین، چنانچہ خلیفہ عبد الملک کے حکم اور خالد کے مشورہ سے ۷۶ھ میں پہلی مرتبہ اسلامی سکے ڈھلوائے گئے[2]،

خلیفہ عبد الملک کے دربار میں خالد بن یزید کے مشورہ کی اہمیت ایک اور تاریخی واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے، عبد الملک کے بھائی محمد بن مروان نے مصعب کو امان دینے کے لئے درخواست کی، اس کے متعلق عبد الملک نے اپنے درباریون سے مشورہ چاہا، علی بن عبد اللہ بن عباس بن عبد المطلب

---

[1] معجم الادباء جلد ۴ ص ۱۶۶ و وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۲۱۱، [2] تاریخ کامل ابن اثیر (مصر) جلد ۴ ص ۱۶۱ و (حیدر آباد) جلد ۲ ص ۵۶،

نے کہا کہ "آپ ہرگز امان نہ دیں" خالد بن یزید بن معاویہ بن ابی سفیان نے رائے دی کہ آپ ضرور امان دیجئے، اس معاملہ پر ان دونوں میں بحث ہوئی، عبد الملک نے خالد کا مشورہ قبول کرکے نہ صرف مصعب کو امان دی، بلکہ اپنے بھائی محمد کو حکم دیا کہ تم خود مصعب کے پاس جاؤ، اور جو وہ طلب کریں اسے قبول کرو،[1]

گیارہویں صدی عیسوی کی ایک کیمیائی تصنیف عین الصنائع وعون الصنائع[2] کے مصنف عبد الملک الصالحی الکاثی نے اپنے دیباچہ میں پانچ ایسے اگلے کیمیا دانوں کا ذکر کیا ہے، جنہوں نے آنے والی نسلوں کے استفادہ کے لئے اس فن پر کتابیں چھوڑیں، ان پانچ ناموں میں ایک خالد ابن یزید کا ہے،[3]

پروفیسر رسکا لکھتے ہیں، کہ بدقسمتی سے اس تصنیف کا پورا متن ابتک شائع نہیں ہوا، خالد کی کیمیا دانی کا انحصار اسی نسخہ کے الفاظ پر ہے،[4]

تصنیفات خالد بن یزید کی کیمیائی تصنیفات آج بدقسمتی سے ناپید ہیں، انکی تعداد زیادہ نہ تھی، جو کتابیں ابن ندیم کی نظر سے گذری تھیں وہ یہ ہیں:-[5]

(۱) کتاب الصحیفۃ الکبیر (۲) کتاب صحیفۃ الصغیر (۳) کتاب الوصیۃ، اس کے چند اوراق کتب خانہ خدیویہ میں ہیں، یاقوت نے دو اور کتابوں کا ذکر کیا ہے، (۱) السر البدیع فی فک الرمز المنیع (۲) کتاب الفردوس[6]

دوسرے مسلمان کیمیا دانوں کی تصنیفات کی طرح خالد کی بعض کتابوں کا بھی لاطینی میں ترجمہ ہوا، رابرٹ اسٹیل نے تین حسب ذیل لاطینی ترجموں کے نام لئے ہیں:-[7]

---

[1] مروج الذہب مسعودی ترجمہ حیدر آباد ص۲۲۲، [2] قلمی نسخہ رامپور نمبر ۱۶، [3] میموائرس ایشیاٹک سوسائٹی بنگال جلد ۸ نمبر ۴ ص ۶۶، [4] اسلامک کلچر جلد ۱ نمبر ۱ ص ۳۶، [5] الفہرست ص ۳۵۴، [6] معجم الادبا جلد ۴ ص ۱۹۶، [7] Quarterly Review, July 1926

(1) Liber Trium Verborum.

(2) Consilium Conjugii.

(3) Liber secretorum. Artis

وفات خالد بن یزید بن معاویہ کا انتھر سال کی عمر میں ۸۵ھ میں انتقال ہوا، یاقوت نے انکی وفات کا سال ۸۵ھ یا ۹۰ھ لکھا ہے، مگر دوسرے سوانح نگار متفق ہیں، کہ خالد کا انتقال ۸۵ھ میں ہوا،

یہ ہیں عہدِ اسلام کے پہلے کیمیا دان کے سوانح حیات جس کا ذوق علم و فن مستشرقین کے نزدیک اکثر معرض بحث رہا کیا،!

نواب داؤد خاں صوبہ دار بہار

اور

جنگ پلاموں کا نادر مرقع

از

جناب حافظ سید عبد الرؤف صاحب اورنگ آبادی

"نواب داؤد خان عہدِ عالمگیری کا ایک ممتاز اور نامور امیر تھا، اسکی صوبہ داری بہار کا قابلِ ذکر واقعہ جنگ پلاموں اور تسخیر پلاموں ہی، جنگ پلاموں کا وہ نادر مرقع جسکو مرقع نگار شاہی نے ۱۰۷۲ھ میں ایک دوہری رنگین چادر پر کشید کیا تھا جو اسوقت پبلک لائبریری شہر گیا میں موجود ہی جس سے جنگ پلاموں کا پرانا منظر پیشِ نظر ہو جاتا ہی، اس کا تحریری عکس ناظرین معارف کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہی"

نام و نسب داؤد خاں[1] نام، خان اور نواب لقب، سلسلۂ نسب عباسی، علوی[2] اور وطن حصار فیروزہ تھا، اس کے اسلاف میں شیخ محمد رضی نامی ایک بزرگ زن و فرزند کے ہمراہ ۹۲۹ھ[3] میں مکہ معظمہ سے کابل آئے اور بابر کے دربار میں حاضر ہو کر مورد عنایات شاہی ہوئے، شیخ موصوف خود تو کابل میں مقیم رہ

[1] نواب ممدوح کے حالات شاہجہان نامہ، بادشاہنامہ، عالمگیر نامہ، مآثر الامراء، سیر المتاخرین معتبر تاریخوں میں ہیں انکے علاوہ دو غیر مطبوعہ بیاضیں ہیں جو نواب مرحوم کے اخلاف میں نواب ممتاز علی خاں کے پاس ابتک موجود ہیں، ایک بیاض عربی ہی جس میں سلسلۂ نسب اور ورود ہندوستان منصبداری اور عہدہ داری کا بیان مع حوالہ ہی دوسری فارسی میں جسمیں قریب قریب پورا تذکرہ ہی مگر ماخذ کا حوالہ نہیں ہی، عربی بیاض مرتبہ ۹۳۲ھ بقلم قاضی محمد راضی بن رضی بن نظام حصار فیروزہ ہی بیاض فارسی مرتبہ ۱۱۴۳ھ بقلم نواب حمید خاں ثانی نبیرہ داؤد خاں ہی، [2] بیاض عربی، [3] بیاض عربی،

گران کے لڑکے بابر کے ہمرکاب تسخیر لاہور کی تقریب سے ہندوستان پہونچے[1]، فتح لاہور کے بعد شاہ ممدوح نے کابل کی راہ لی، اور شیخ کے لڑکون نے دہلی کا رخ کیا، شیخ کے فرزند شیخ راضی مع بھائیون کے ابراہیم لودی شاہ دہلی کے حضور میں حاضر ہو کر خدمت سلطانی کے طالب ہوئے،

شیخ محمد راضی، شیخ محمد راضی بن محمد رضی منصب قضا پر سرفراز ہوئے[2]، اور ان کے بھائی شاہی فوج میں داخل ہوئے، قاضی محمد راضی کچھ دنون کے بعد ایک ناگوار واقعہ کے سبب سے ۹۳۲ھ میں مسند قضا سے علیحدہ ہو کر حصار فیروزہ چلے گئے[3]، اور ان کے بھائی ابراہیم لودی اور بابر کی جنگ میں کام آئے، بھائیوں کی شہادت سے متاثر ہو کر قاضی محمد راضی نے دنیاوی منصب وجاہ سے کنارہ کشی اختیار کر لی،

شیخ بھیکن خان شیخ بھیکن خان[4] (پدر نواب[5] داؤد خان) عہد جہانگیری میں خانجہان لودی کے دربار سے متعلق ہو کر خانجہان کی زندگی بھر داد شجاعت دیتا رہا، اور خانجہاں لودی اور شاہجہاں کی جنگ میں حق رفاقت ادا کرتا ہوا مارا گیا[6]،

داراشکوہ کے دامن سے وابستہ ہونا، بھیکن خان کی وفات کے بعد داؤد خان نواب اعظم خان کی عرضداشت کے ہمراہ شاہجہان کے حضور میں حاضر ہو کر خدمت کا طالب ہوا، شاہجہان نے داؤد خان کو شاہزادہ داراشکوہ کے حوالہ کر دیا، شاہزادہ موصوف نے خان مذکور کو اپنی رفاقت میں رکھا، اور متھرا کی سرداری اور خان کا خطاب عطا کر کے متھرا روانہ کیا، داؤد خان داراشکوہ اور اورنگزیب عالمگیر کی جنگ میں شاہزادہ مراد بخش کے مقابلہ میں داراشکوہ کی حمایت میں لڑا، شاہزادہ داراشکوہ

[1] بیاض عربی، [2] بیاض عربی، [3] بیاض عربی، [4] شیخ بھیکن فیروزہ کے شیخ زادوں اور خانجہاں لودی کے معتمد ملازموں میں تھا، مآثر الامراء جلد اول ص ۷۶۲، [5] مآثر الامراء نے داؤد خاں کو بھیکن خان لکھا ہی، مگر بیاض فارسی نے برادر بھیکن خان پسر کبیر خاں بیان کیا ہی، ان دونوں بیانوں میں مآثر الامراء کے بیان کو ترجیح ہی، [6] بیاض فارسی،

کی ناقدری اور غلط فہمی کے سبب سے ملازمت ترک کرکے ۱۰۶۶ھ میں اپنے وطن حصار فیروزہ کو روانہ ہوگیا

عالمگیری دربار سے تعلق، شاہزادہ دارا شکوہ سے اس کی وفاداری کو دیکھ کر اورنگ زیب عالمگیر نے داؤد خان کو حصار فیروزہ سے طلب کرکے منصب و نقارہ و جدہ ہزار اور خطاب خانی سے سرفراز کیا،[1]

داؤد خان کی شاہزادہ شجاع سے جنگ آزمائی اور صوبہ داری پٹنہ پر سرفرازی، شاہزادہ شجاع اور عالمگیر کی جنگ میں داؤد خان نے داد جوانمردی دے کر شجاع کو شکست دی، اس کے صلہ میں منصب ہزاری اور پٹنہ کی صوبہ داری سے سرفراز ہوا،[2] اور سالار اعظم نواب معظم خان (میر جملہ) کی کمک میں جانے کا حکم ملا، اسوقت نواب معظم خان اکبر نگر (راج محل) کے محاذ پر شاہزادہ شجاع سے برسر پیکار تھا، داؤد خان اپنے بھتیجے شیخ محمد حیات کو پندرہ سولہ سو سوار اور ایک ہزار پیادہ فوج کیساتھ پٹنہ میں چھوڑ کر خود حسب فرمان شاہی یکم رمضان ۱۰۶۹ھ کو رشید خان، مرزا خان، ہادی خان، قادر خاں، خواجہ عنایت اللہ اور دوسرے نامور جاگیرداروں کے ہمراہ کسی نہ کسی طرح معرکۂ جنگ میں پہونچا، داؤد خان کے پہونچنے کے بعد مانڈہ کے قریب ایک گھمسان جنگ کے بعد شاہزادہ موصوف نے شکست کھا کر ڈھاکہ کی راہ لی، اور اکبر نگر، مانڈہ وغیرہ بنگال کے علاقے سالار اعظم معظم خان کے قبضہ میں آگئے، مفسدوں کی سرکوبی اور بنگال کے نظم و نسق سے داؤد خاں کی فراغت کے بعد عالمگیر نے صفر ۱۰۷۰ھ میں اسکو بہار کی مستقل صوبہ داری عطا کرکے پٹنہ واپس جانے کا حکم دیا،[3]

پلاموں اور یہاں کے زمیندار، پلاموں[4] صوبہ بہار میں دکھن سمت میں ایک وسیع کوہستانی علاقہ ہے، جو گھنے جنگلوں اور پہاڑی سلسلوں کے حصار کی وجہ سے سخت دشوار گذار ہے، اس لئے یہاں کے

[1] بیاض فارسی، [2] سیر المتاخرین صفحہ ۲۱، [3] عالمگیر نامہ مختلف صفحات، و سیر المتاخرین ص ۳۱۶ و سیر المتاخرین ص ۳۲۲ و عالمگیر نامہ، [4] اس وقت علاقہ پلاموں کا صدر مقام ڈالٹن گنج ہے، جہاں ڈپٹی کمشنر رہتا ہے، پلاموں کے حلقہ میں خود سر ریاستیں بکثرت ہیں،

راجاؤں اور زمینداروں[1] پر قابو پانا نہایت دشوار تھا، یہاں کا راجہ پرتاب سنگھ دور شاہجہانی میں اس درجہ سرکش تھا، کہ اطاعت قبول ہی نہ کرتا تھا، اور عارضی طور سے مطیع بھی ہو جاتا تھا، تو غداری کرتا تھا، سب سے پہلے نواب شایستہ خان پسر آصف خان نے ۱۰۵۱ھ میں پلاموں پر فوج کشی کی، اس کے دشوار گذار جنگلوں اور پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ بنایا، اور پلاموں پہونچکر محاصرہ کر لیا، اور راجہ کے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کر دیا، راجہ نے بالآخر تنگ آکر اطاعت قبول کر لی، اور ہر سال گذرنے پر ہزار روپیہ پیشکش لیکر حاضر ہونے کا وعدہ کیا،[2]

نواب اعتقاد خاں کی جگہ جب شایستہ خان ۱۰۵۲ھ میں مسند آرائے صوبہ بہار ہوا، تو اسکو زمیندار مذکور کی سرکشی اور عہد شکنی کی وجہ سے اسکی تنبیہ کی فکر ہوئی، اسی درمیان میں راجہ پرتاب سنگھ کے چچا دریا رائے اور تیج رائے نے نواب اعتقاد خان سے مل کر پرتاب سنگھ کو گرفتار کرکے حاضر کرنیکا وعدہ کیا، لیکن پلاموں واپس جانے کے بعد پرتاب سنگھ کی جگہ خود راجہ بن بیٹھا، اعتقاد خاں کو اسکی خبر ہوئی، تو اسی وقت زبردست خاں کو ایک بڑی فوج کے ہمراہ پلاموں روانہ کیا، زبردست خان نے دیوگڈہ کے قلعہ پر جو اس علاقہ میں سب سے بڑا قلعہ تھا قبضہ کرکے جنگل صاف کرنا شروع کر دیا، اس درمیان میں تیج رائے نے چھ سو سوار اور سات ہزار پیادے فراہم کرکے زبردست خان پر شبخون مارنے کا ارادہ کیا، خان موصوف کو اسکی خبر ہوگئی، لیکن دشمن دفعتہً ان پر ٹوٹ پڑے اور بہت سے آدمی قتل و گرفتار کر لئے، نواب اعتقاد خان کو اس واقعہ کی خبر ہوئی، تو اس نے فوراً عبد الرشید خاں نجم ثانی کی سرکردگی میں اپنی ماتحت فوج کو کمک کے لئے روانہ کیا، لیکن کمک پہنچنے کے قبل ہی اتفاق سے ۳ رمضان ۱۰۵۴ھ کو تیج رائے شکار کے ارادے سے قلعہ سے باہر نکلا،

[1] جنگ پلاموں کے تذکرہ کے قبل زمیندار پلاموں کے تاریخی احوال کا ذکر ضروری تھا تاکہ جنگ پلاموں کا اصل سبب ناظرین پر ظاہر ہو جائے، [2] شاہجہان نامہ جلد دوم ص ۳۴۶،

اور صورت سنگھ اور دوسرے اہالی قلعہ نے راجہ پرتاب سنگھ کو قید سے رہا کرکے قلعہ اس کے حوالہ کر دیا
تیج رائے کے رفقاء میں سے بعض نے قلعہ میں داخل ہوکر پرتاب کا ساتھ دیا، اور بعض نے
فرار اختیار کی، ان عیاریوں سے تیج رائے مصیبت میں گرفتار ہوا، ان واقعات کی خبر پا کر
زبردست خاں نہایت چستی اور دلیری سے جنگل کی دشوار گذار گھاٹیوں کی طرف بڑھا، اور مفسدوں
کو گرفتار کرکے ان کو سرِ راہ قتل کرنا شروع کر دیا، یہ صورت دیکھ کر راجہ پرتاب نے خان موصوف کی خدمت
میں عرضداشت بھیجی، کہ میں دولت خواہوں میں رہنا چاہتا ہوں، اگر معاہدہ کرکے اس امر کا پورا اطمینان
دلا دیا جائے، کہ مجھ کو ایذا نہ پہنچائی جائیگی، تو فرمانبردارانہ حاضر خدمت ہوں، اور حضور والا کے ہمراہ
نواب اعتماد خان سے شرفِ ملاقات حاصل کرسکوں،

زبردست خاں نے راجہ کی دلدہی اور دلجوئی کی، اور نواب اعتقاد خان کا مہر شدہ عہد نامہ
بھیجدیا، اس اطمینان کے بعد، ر رمضان ۱۰۵۴ھ کو راجہ پرتاب نے زبردست خاں سے ملاقات کی،
اور زبردست خاں کے ہمرکاب نواب اعتقاد خان سے ملنے کے لئے پٹنہ روانہ ہوا، اور نواب کی خدمت
میں ایک ہاتھی نذرانہ پیش کرکے ایک لاکھ روپیہ سالانہ پیشکش دینے کا وعدہ کیا، نواب اعتقاد خاں
نے ان واقعات کی اطلاع دربار شاہی میں بھجوائی، شاہجہان نے پرتاب سنگھ کو منصب ہزاری عطا
کیا، اور پلاموں کی آمدنی ایک کرور دام سالانہ مقرر کرکے پلاموں کو پرتاب سنگھ کی جاگیر میں دیدیا
۲۴ صفر کو ۱۰۵۶ھ کو نواب شایستہ خاں نے الہ آباد سے اور نواب زبردست خاں نے پٹنہ سے
دہلی جاکر پرتاب سنگھ کی طرف سے ایک فیل اور ہزار اشرفی، اور زبردست خاں کی طرف سے جواہر اور
مرصع آلات بادشاہ کے حضور میں نذرانہ پیش کئے[۳]،

---

[۱] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۲۴۰، [۲] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۲۴۸، ۲۵۰، [۳] شاہجہان نامہ جلد دوم ص ۴۰۵،

نواب داؤد خاں اور جنگ پلاموں | راجہ پرتاب سنگھ نے ایک لاکھ روپیہ سالانہ خراج سلطانی ادا کرنے کا
وعدہ کرکے صلح کی تھی، مگر یہ رقم کبھی ادا نہ کی، اور جب یاددہانی پر بھی نہ دی، تو اورنگ زیب عالمگیر نے
نواب داؤد خاں صوبہ دار پٹنہ کو پلاموں پر فوج کشی کرنے کا حکم دیا، اور صوبہ بہار کے مشہور جاگیرداروں
زمینداروں اور فوجداروں کو کمک میں حاضر رہنے کی تاکید لکھی، اس حکم پر داؤد خاں ۴ شعبان ۱۰۷۱ھ کو
مرزا خاں فوجدار دربھنگہ تہور خاں جاگیر دار چین پور، راجہ بہروز زمیندار مونگیر، اور دوسرے با اثر ذی اقتدار
لوگوں کو لیکر پٹنہ سے دکھن کی طرف روانہ ہوا، راجہ پرتاب کے متعلقین نے قلعہ کوٹھی کو چھوڑکر اور کنڈہ کی
راہ لی، اور داؤد خاں نے قلعہ مذکور پر بلا مزاحمت ۵ رمضان ۱۰۷۱ھ کو قبضہ کرلیا، جب مفرور قلعہ کنڈہ
میں جو ایک مستحکم مقام تھا، پناہ گزین ہوئے، تو داؤد خاں نے بانس کے گھنے جنگلوں کو کٹوا کر راستہ بنانا
شروع کیا، لیکن اس اثناء میں دشمنوں نے اسکو بھی خالی کر دیا، اسلئے نواب نے ۴ شوال کو اس پر
بھی قبضہ کرکے اسکی مستحکم فصیلوں کو منہدم کرا دیا، لیکن برسات کا موسم آجانے کے سبب آگے بڑھنا مناسب
نہ سمجھا، اور کوٹھی اور کنڈہ کے درمیان ہر تین کوس پر مٹی کی فصیل بنواکر سپاہیوں کے لئے چھاؤنیاں
تیار کروائیں، اور ہر ایک چھاؤنی میں سو سوار اور کچھ پیادے اور تفنگچی متعین کر دیے، اس انتظام کو
دیکھ کر راجہ نے معذرت اور مصالحت کی نیاز مندانہ گفتگو شروع کی، لیکن داؤد خاں نے ایک نہ سنی
اور برسات گذرنے پر غرہ ربیع الاول ۱۰۷۱ھ کو پلاموں پر تاخت کر دی، اور برادر زادہ شیخ نامدار
خاں کو پانچسو سپاہ اور راجہ بہروز کو چار سو سوار اور ڈیڑھ ہزار پیادوں کے ہمراہ جرنغار قائم کیا، اور
خود دو ہزار سوار کے ساتھ قلب میں رہا، اور پانچ سو سواروں کا ایک دستہ پشت پر متعین کیا، جنگل

---

[۱] عالمگیر نامہ ص ۲۵۱، [۲] شہر گیا سے دکھن سمت تقریباً ۲۰ کوس پر یہ مقام واقع ہے، جہاں شرفا اور
پٹھان زمیندار رہتے ہیں، تاحال اس عہد کے دمدمے اور خام مورچوں کے آثار ملتے ہیں، [۳] کنڈہ کوٹھی سے چار
کوس اور آگے دکھن جانب واقع ہے، یہاں کا راجہ مشہور ہے،

کاٹ کر راہ ہموار کرنے کی غرض سے بیلداروں کی ایک جماعت آگے روانہ کی، اور فوج آہستہ آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی ۹ ربیع الاول کو دس کوس پر مقام ترہیسی[1] میں ٹھہری،

یہ خبر سُن کر راجہ خوف زدہ ہوا، اور معتمد خان صورت سنگھ کو داؤد خان کے حضور میں روانہ کیا اور ایک لاکھ روپیہ بادشاہ کو پیش کش اور پچاس ہزار روپیہ داؤد خان کو نذرانہ دینے کا وعدہ کیا، داؤد خاں بارگاہ سلطانی میں ان واقعات کی اطلاع بھیجکر جواب کا انتظار کرنے لگا، ابھی جواب نہ آیا تھا کہ راجہ کے آدمیوں نے داؤد خان کی فوج کی رسد لوٹ لی، اس واقعہ سے داؤد خان سخت برہم ہوگیا اور اعلان جنگ کر دیا، ہر چند راجہ نے لاعلمی ظاہر کرکے اپنی برأت چاہی اور پچاس ہزار روپیے پیش کرکے معافی کا خواستگار ہوا، مگر داؤد خان نے اسکی سابق بدعہدیوں پر نظر کرکے نذرانہ اور معذرت پر مطلق توجہ نہ کی، اور ۸ ربیع الثانی کو کوچ کرکے ۱۰ ربیع الثانی کو پلاموں کے قریب قیام کیا، بالآخر راجہ کی فوج بھی مستعد ہوکر مقابلہ کو نکل کھڑی ہوئی، ٹھیک اُس وقت فرمان شاہی صادر ہوا کہ راجہ پلاموں اگر حلقہ بگوش اسلام ہوجائے، تو اسکی ریاست اس کے حوالہ کردیجائے، ورنہ اس بدعہد بدنہاد کا استیصال کردیا جائے داؤد خان جان بخشی کے لئے دوسرا عریضہ بھیجکر اس کے جواب کے انتظار میں تھا، کہ تہور خان برلاس نے بلا اجازت ۲۴ ربیع الثانی کو دفعۃً حریف پر حملہ کر دیا، ناچار داؤد خان کو بھی شریک جنگ ہونا پڑا، دشمن کی فوج نے تھوڑے فاصلہ پر مورچال قائم کیا، اور اسی جگہ صبح سے شام تک سخت جنگ ہوتی رہی، تہور خان کے سولہ سپاہی مقتول اور پچاس مجروح ہوئے، شب کو دشمنوں نے دو بڑی توپیں اپنے مورچال پر نصب کر دیں، صبح کو داؤد خان نے اس کی زد سے نکل کر ایک پہاڑی پر پناہ لی، اور توپیں چڑھا کر دشمنوں کے مورچال کو اپنی زد میں لے لیا، ۲۷ ربیع الثانی ۱۰۷۱ھ کو دشمنوں نے ہٹ کر ندی کے کنارہ جسکے پہلو میں گھنا جنگل تھا، مورچال بنایا، داؤد خان نے

[1] پلاموں سے ۱۲ کوس شمال مشرق میں واقع ہے،

جنگل کٹوا کر بقدر ضرورت راستہ بنوایا، اور برادر زادہ شیخ تاتار اور شیخ احمد اور راجہ بہروز مرزا خان تہور خان اور شیخ صفی خان وغیرہ کو حملہ کا حکم دیا،

ایک مختصر لیکن سخت جنگ کے بعد دشمنوں نے فاش شکست کھائی، سیکڑوں مقتول ہوئے اور اکثر مجروح ہوکر جنگلوں میں جا چھپے، داؤد خان کا خیال تھا کہ مال غنیمت سے جو کچھ قبضہ میں آئے اس کے تحفظ کا انتظام کرنے کے بعد قدم آگے بڑھایا جائے، مگر لشکر نے مضطربانہ دشمنوں کا تعاقب کر دیا، اور سواروں نے ندی عبور کرکے حصار شہر پر حملہ کر دیا، دشمن قدم جما نہ سکے اور فرار ہوکر پلاموں کے نئے اور پرانے قلعوں میں پناہ گزیں ہوگئے، راجہ پرتاب نے اہل و عیال کے ہمراہ مال و اسباب جنگل میں بھیجدیا اور شاہی فوج شہر کو تاراج کرتی ہوئی قلعہ کے در تک جا پہونچی، اور حریف کی فوج پسپا ہوکر قلعہ میں محصور ہوگئی، اور کچھ رات گئے تک توپ و تفنگ سے مقابلہ کرتی رہی لیکن آخر میں راجہ مقابلہ کی تاب نہ لاکر قلعہ کے عقب سے نکل کر جنگل کی سمت بھاگ نکلا، راجہ کے بھاگتے ہی پلاموں کے دونوں قلعے شاہی فوج کے قبضہ میں آگئے،

راجہ کے جان نثاروں نے قلعہ سے فرار ہوکر مقام دیوگاؤں میں جمعیت فراہم کرکے مقابلہ کی تیاری کی، مگر صفی خان نے اس پر بھی قبضہ کرلیا[1]،

فتح پلاموں کے بعد داؤد خاں حسب فرمان شاہی قلعوں کی نگرانی، اور پلاموں کی فوجداری منگلی خاں[2] کے سپرد کرکے ماتحت فوج کے ہمراہ اپنے مستقر پٹنہ واپس آیا،

جنگ پلاموں کا پرانا و نادر مرقع،

اسی جنگ کے موقع پر یعنی ۱۰۷۱ھ میں شاہی مرقع نگار نے دو بڑی رنگین چادروں

[1] جنگ پلاموں کا پورا بیان عالمگیر نامہ صفحات ۶۶۰، ۶۵۱ سے ماخوذ ہے [2] عالمگیر نامہ صفحہ ۹۲۳ جمادی الاول ۱۰۶۹ھ میں منگلی خاں کو اورنگ زیب عالمگیر نے سارن کی فوجداری مع خلعت و منصب ہزاری و پانصدی عطا کی تھی،

پر اس جنگ کا اس حسن و خوبی کیساتھ مرقع کھینچا ہے کہ جنگ کے تمام مناظر نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں، یہ رنگین چادر چالیس فیٹ لمبی اور دس فیٹ چوڑی ہے، اس میں قلعہ پلاموں، بعض دوسری عمارتوں، جنگ کا سمان، فوج کی ترتیب وغیرہ کے مناظر دکھائے گئے ہیں، جابجا فارسی کی تحریروں سے تشریح بھی کی گئی ہے، جس سے جنگ کے تاریخی حالات ظاہر ہو جاتے ہیں، یہ مرقع نواب داؤد خاں مرحوم کے ورثہ میں وراثتہً چلا آرہا تھا، چنانچہ نواب ممتاز علی خانصاحب[1] کے خزانہ میں منجملہ اور متروکات کے یہ نادر مرقع بھی تھا، مگر ایک نالائق عزیز[2] کے ذریعہ پبلک لائبریری گیا[3] میں پہنچ گیا، جو باحتیاط تمام محفوظ ہے، مرقع کے مطابق نقشۂ جنگ کی تفصیل یہ ہے :-

شمالی سمت لشکر شاہی، جنوبی سمت راجہ پلاموں کا لشکر گاہ اور مورچال، شمالی سمت کی سطح پر شاہی فوج کے افسروں کے خیموں کے مناظر، خیمہ تہور خان، مرزا آصفی خان، شیخ تاتار، شیخ احمد برادر زادگان نواب داؤد خان، راجہ بہروز، صدر میں امارت پناہ نواب داؤد خان کا معہ خیمہ، ان خیموں کے بالمقابل شاہی مورچال کے نقش و نگار ہیں، جکی بالائی سطح پر توپیں نصب ہیں، شاہی فوج سوار و پیادہ فوجی ترتیب کیساتھ حکم کی منتظر کھڑی ہے، شاہی مورچال کے ٹھیک سامنے حریف کے مورچال کے آثار ہیں، اس کے بعد کنوروں، راجاؤں، اور جنگلی قوموں کی فوج سوار و

---

[1] نواب صاحب موصوف ایک کہن سال بزرگ ہیں، ان کا سن پچاسی سے اوپر ہے، انکی آنکھوں نے بقیۃ السیف امرائے خاندان کی امارت کا جاہ و جلال دیکھا ہے، وہ داؤد نگر کے قلعہ کے ایک گوشہ میں سکونت پذیر اور گردش زمانہ کا شکار ہیں، ان کے قبضہ میں نواب ممدوح کے متروکات میں سے یہ چند نوادر ہیں، دارا شکوہ، عالمگیر تا محمد احمد شاہ کے فرامین، طشت، صراحی، گڑگڑی اور بعض دوسری اشیاء، [2] ضلع گیا کے حاکم اور کمشنر نے اس مرقع کو نواب ممتاز علی خاں سے عجائب خانہ لندن کے لئے خریدنا چاہا تھا، اور اس کے معاوضہ میں گرانقدر رقم پیش کی تھی مگر خود نواب ممتاز علی خان نے نہ دیا، سوئے اتفاق سے ایک عزیز نے چوری کر کے اسے بابو منو لال گیا کے ہاتھ معمولی

پیادہ صف بستہ ہے، جن کے ہاتھوں میں قدیم جنگی ہتھیار، تیر و کمان، تیغ و تبر، نیزہ اور سنان وغیرہ ہیں، چند قدم بڑھکر جنگ شروع ہے، اور تیر و سنان، تیغ و تبر کے علاوہ دونوں طرف سے توپیں چل رہی ہیں، لشکر شاہی میں جو بڑا آدمی توپ کی زد میں آتا ہے، اوس کی اور گولہ کی تصویریں کیساتھ جابجا تحریر ہے "فلاں زخم گولہ خورد ابراہیم غوری از تابینان امارت پناہ داؤد خان از زخم گولہ بکار آمد" اس منظر کو دیکھ کر شاہی لشکر نے ایسا زبردست حملہ کیا کہ حریف اس کی تاب نہ لا سکے، اور راہ فرار اختیار کی، "مقہوران پلاموں شکست خوردہ بجرگہ پیوستند" آگے بڑھکر حریف کے مورچال کے مرقعے ہیں، جن میں بڑے اہتمام سے توپیں نصب ہیں، مسلح سوار و پیادوں کا ہجوم ہے، جابجا راجاؤں اور کنوروں کے خیمے نصب ہیں، اس جگہ مرقوم ہے "ڈیرۂ زمینداران الماس و خیمۂ کنوران"،

لشکر شاہی بھی ایک پہاڑ کی سطح پر توپیں نصب کیے ہوئے مقابلہ میں ہے، توپوں کی باڑھ چل رہی ہے، معرکۂ کارزار گرم ہے، خود امارت پناہ داؤد خاں میدان جنگ میں نبرد آزما ہے، کہیں اسپ تازی پر سوار تیغ زنی اور کہیں پیادہ پا تیر اندازی کے جوہر دکھا رہا ہے، یہاں مرقوم ہے "خود امارت پناہ و دیگر سواران لشکر اسپان خود را گذاشتہ پیادہ شدہ جنگ نمایند"،

داؤد خاں کی شبیہ تین جگہ تین حالتوں کی ہے، پہلی جگہ ہاتھی پر سوار ہے، جنگ کا نشان ہاتھ میں ہے، دوسری جگہ زرین غاشیہ پوش گھوڑے پر شمشیر بکف ہے، تیسری جگہ پیادہ جھکا ہوا ہاتھوں میں تیر و کمان ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۸۰) رقم میں فروخت کر ڈالا، [3] سورج پرشاد بنگرا اپنے والد منو لال کی یاد گار میں یہ لائبریری ۱۹۱۱ء میں قائم کی، اس لائبریری کا افتتاح پنڈت مدن موہن مالوی نے کیا تھا، کل بتیس ہزار ۳۲۰۰۰ کتابیں ہیں، ان میں دو ہزار قلمی نسخے ہیں، بعض دوسرے نوادر بھی پائے جاتے ہیں، لائبریری مذکور کے موجودہ مالک کی اجازت سے ہمارے محترم دوست مولوی سید فصیح الدین صاحب بلخی ریونیو افسر نے اس مرقع کا عکس لیا ہے، مگر عکس صاف نہیں آیا ہے، تاہم غنیمت ہے، موصوف نے اسکی ایک کاپی راقم الحروف کے پاس بھیجی ہے،

نواب داؤد خان اور عام شاہی لشکرؐ کے بالمقابل "بند ہائے شاہی" اور دوسری

جانب "کنوران پلاموں کو لان پلاموں" مرقوم ہے، شاہی لشکر فاتحانہ قدم بڑھارہا ہے غنیم کی فوج

پسپا ہوتی ہوئی لب دریا پہونچ چکی ہے جہاں دریا ساحل دریا اس پار کے راستوں شہر کی عمارتوں آم اور دوسرے

پھلدار درختوں، حصار شہر، شہر کی عمارتوں، اور پلاموں کے قلعہ کے مناظر ہیں، اور ان پر اشارات

مرقوم ہیں لشکر شاہی تاخت و تاراج کرتا ہوا، دریا عبور کرکے حصار شہر پر حملہ آور ہوگیا ہے غنیم فرار ہو کر قلعہ پلاموں

میں پناہ گیر ہے، قلعہ مذکور کے چند پھاٹک ہیں جنکو در شرقیہ، در غربیہ، در شمالیہ، در جنوبیہ کے ناموں کے موسوم

کیا گیا ہے بالائے قلعہ مرقوم ہے "قلعہ پلاموں کہ میان شہر واقع است سنگین" قلعہ کے گرد مختلف رنگوں کے آم

کے باغوں اور کوچوں کے مختلف مناظر ہیں، قلعہ کی مساحت کی بابت پائین میں تحریر ہے "دور واطراف بیرون

و کلعہ نو ذرع برج دوازدہ ذرع" اسکے بعد شاہی فوجیں حصار شہر کو عبور کرکے شہر کو تاراج کرتی ہوئی قلعہ کے نزدیک

پھاٹک پر جا پہونچی ہیں یہاں مرقوم ہے "روزیکہ امارت پناہ داؤد خاں بر قلعہ پلاموں یورش نمودہ فوج بسیار اندر

لشکر گذاشتند توپ و تفنگ سے قلعہ بند جنگ گرم تھی کہ دفعۃً رات کے وقت راجہ پرتاب سنگھ اپنے حامی مددگاروں کے ہمراہ

پشت قلعہ کے دریچہ سے فرار ہو کر جنگلوں میں روپوش ہوگیا چنانچہ دریچہ مذکور کے بالمقابل مکتوب ہے "کھڑکی کہ جانب

جنوب واقع است ازین راہ روز فتح بشب زمیندار پلاموں گریخت" اسکے فرار کیساتھ قلعہ فتح تھا پرچم شاہی اس کے

درانے لگا قلعہ کے اندر ایک عالیشان مسجد ہے جسکے مقابل تحریر ہے کہ "امارت پناہ داؤد خان درین جا این طرح مسجد بنای کند

قلعہ کے باہر بھی لب دریا دوسری چھوٹی سی مسجد باغوں کے بیچ میں نظر آتی ہے یہاں مکتوب ہے "امارت پناہ باین طرح مسجد دوم

انداخت" قلعہ مذکور کے سمت جنوب پہاڑ کی چوٹی پر ایک چھوٹے سے قلعہ کا نقشہ نمایاں ہے شاید راجہ نے بھاگ کر وہیں پناہ

لی ہوگی قلعہ مذکور کے بالمقابل تحریر ہے "متصل قلعہ جنوبیہ کوہ واقع است بالائے آن دیوار ریختہ کشیدہ اند قلعہ بالائے

کوہ واقع است" یہ تمام تصویریں مرقعے اور انکے متعلق تحریریں بالکل تازہ معلوم ہوتی ہیں، (باقی)

لہ یہ مسجد ابتک موجود ہے اور اسکی پیشانی پر ذیل کا شعر منقوش ہے اس سے تاریخ بنا بھی نکلتی ہے "کفر دریں بود پلاموں از بزد اعلیٰ داؤد خان اسلام کرد"

۱۰۸۲ھ

عربی شفاخانے

مترجمہ

جناب مولوی محمد یوسف صاحب رفیق دار المصنفین

"اسلامی شفاخانوں پر سب سے پہلا مضمون مولانا شبلی مرحوم کا نکلا تھا، اسوقت سے لیکر اسوقت

تک بہت سے نئے معلومات بڑھ گئے ہیں، ابھی حال میں مصر کے ڈاکٹر سامی حداد کا ایک مفصل

مضمون عربی شفاخانوں کے عنوان سے المقتطف میں چھپا ہے، جو بہت حد تک دلچسپ اور

مفید ہے اور اس میں بہت سی نئی باتیں ہیں، اسلئے اسکا ترجمہ ناظرین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا"

"معارف"

تاریخ کے فن سے جو دلچسپی رکھتے ہیں، اور تلاش و تحقیق کے شیدا ہیں، وہ اسکو تسلیم کریں گے

کہ شفاخانوں کا وجود اور رواج عربوں کی تہذیب و تمدن کے قابل فخر کارناموں میں سے ایک بڑا

کارنامہ ہے،

اسلام سے پہلے اہل عرب صرف خود درد طبابت سے آشنا تھے، اس زمانہ کے لوگوں میں

دو صرف دو طبیبوں حارث بن کلدہ ثقفی، اور اسکے لڑکے نضر کے نام معلوم ہیں، جنکو فن طب کے سیکھنے کا

بہت شوق تھا، چنانچہ انھوں نے اسکے سیکھنے کے لئے کئی ملکوں کا سفر کیا، اور آخر میں نوشیروان کے

عہد سلطنت میں فارس کے مشہور شہر جندیسابور پہنچے اور وہاں کے شفاخانہ میں جو ایک نسطوری طبیب

نطس کی نگرانی میں تھا، داخل ہو کر طب کی تعلیم حاصل کی، اور وطن لوٹکر طب کا پیشہ اختیار کیا، (۲۱)

افسوس ہے کہ زمانہ اسلام اور اس سے پہلے کے شفاخانوں کے متعلق ہم تک بہت کم حالات پہنچے ہیں، پھر بھی ہم ان کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں، وہ اس ثبوت کے لئے کافی ہے کہ مسلمان بادشاہوں اور امیروں کو رفاہ عام کے کاموں سے بڑی دلچسپی تھی، وہ دواخانوں اور شفاخانوں کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اسلئے وہ ان پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے، اور ان کے لئے وہ تمام چیزیں مہیا کرتے تھے جنکی ان شفاخانوں کو ضرورت پڑتی تھی،

چنانچہ اسی ذاتی ذوق و شوق کی بنا پر خلفاء، حکام اور امراء نے مکہ، مدینہ، بغداد، دمشق، طرابلس، حلب، انطاکیہ، قاہرہ اور اندلس جیسے آباد اور پر رونق شہروں میں بہت سے شفاخانے قائم کئے، جن کا ذکر سیاح اپنے سفرناموں میں بڑے ہی تعجب اور بڑی تعریف کیساتھ کرتے ہیں،

جگہ کا انتخاب، خلفاء اور حکام و امراء شفاخانوں کے بنانے سے پہلے انکے لئے بہتر اور مناسب جگہ کے انتخاب پر کافی غور و خوض کر لیتے تھے، چنانچہ شفاخانہ عضدیہ کے متعلق لکھا ہے کہ جب عضد الدولہ شاہ دیلم نے بغداد میں شفاخانہ تعمیر کرانے کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے جگہ کے متعلق رازی سے مشورہ کیا، رازی نے اپنے بعض نوکروں کو حکم دیا کہ بغداد کے مختلف گوشوں میں کچے گوشت کے ٹکڑے ہوا میں باندھ آئیں، پھر تجربہ کیا کہ کس گوشہ کا ٹکڑا جلد خراب ہوتا ہے، چنانچہ رازی نے شفاخانہ عضدیہ کے لئے وہی جگہ منتخب کی، جہاں کچے گوشت کا ٹکڑا بہت دیر میں خراب ہوا تھا، (۳۲)

اسی طرح سلطان صلاح الدین ایوبی کے متعلق لکھا ہے کہ جب وہ مصر پر قابض ہوا اور شاہی محل کا مالک ہوا، تو اس نے اس قطعہ زمین کو جسکو عزیز بن معز نے ۳۸۴ھ/۹۹۴ء میں صاف اور ہموار کیا تھا، شفاخانہ بنا دیا، کیونکہ اس قطعہ زمین کے متعلق یہ مشہور تھا، کہ اس میں ایک ایسا طلسم ہے، جس کی وجہ سے اس میں چیونٹی یا دیمک نہیں داخل ہو سکتی، (۱۸)

اسلام کا پہلا شفاخانہ کوڑھیوں کیلئے، ابتداء اسلام میں جس قسم کے شفاخانوں کی ضرورت پڑتی

گئی اسی قسم کے شفاخانے تیار ہوتے گئے، چنانچہ سب سے پہلا شفاخانہ جو ولید بن عبد الملک کے عہد سلطنت میں دمشق میں تعمیر ہوا وہ کوڑھیوں کے لئے تھا، کیونکہ جب ولید بن عبد الملک نے دیکھا کہ کوڑھیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، تو اس نے ۸۸ھ میں ایک شفاخانہ تعمیر کروایا، اور تمام کوڑھیوں کو اس میں داخل کر کے سب کے روزینے اور وظیفے مقرر کر دیے، اور ان کو حکم دیا کہ وہ لوگوں کے سامنے نہ آیا کریں اور تندرست لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے سے پرہیز کریں، (۱)

پاگل خانہ، اہل عرب مجذوبوں، پاگلوں، دیوانوں، ہمیشہ کے بیماروں، عاجزوں اور اندھوں وغیرہ کے آرام و آسایش کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے، چنانچہ اس غرض سے انہوں نے خاص خاص شفاخانے تعمیر کئے تھے، فاس میں سید ابو العباس سبتی نے مزمن امراض والوں اور اندھوں کیلئے ایک شفاخانہ تعمیر کیا تھا، اسی طرح مراکش میں سید فرج نے پاگلوں کے لئے ایک شفاخانہ تعمیر کیا تھا، (۱) اس سے اندازہ ہو گا کہ اس زمانہ کے عربوں کے تمدن کے مقابلہ میں قرون وسطی کے اہل یورپ کا تمدن کتنا پست تھا، جو مریضوں اور جذامیوں کو آگ میں زندہ جلا دیتے تھے، یا طرح طرح کی تکلیفیں پہنچا کر وقت سے پہلے فنا کے گھاٹ اوتار دیتے تھے،

گشتی شفاخانے، مسلمان امیروں اور حاکموں نے صرف یہی نہیں کیا کہ بڑے بڑے شہروں میں شفاخانے بنائے، بلکہ گشتی شفاخانے بھی قائم کئے، تاکہ اطباء ان چھوٹے چھوٹے قصبات کا دورہ کر کے لوگوں کا علاج کریں، جو بڑے بڑے شہروں سے دور تھے، اور جہاں کے لوگ سفر کی تکلیف برداشت کر کے بڑے شہروں کے شفاخانوں تک نہیں پہونچ سکتے تھے، چنانچہ عضد الدولہ کے زمانہ میں وزیر علی بن عیسیٰ نے محکمہ طبابت کے افسر سنان بن ثابت کے نام ایک فرمان جاری کیا تھا جس میں وہ لکھتا ہے کہ:-

" میں نے ان لوگوں کے بارے میں غور کیا جو شہروں سے بہت دور دیہات میں

زندگی بسر کرتے ہیں، خدا تمھاری عمر دراز کرے، تم ایسے طبیبوں کو مقرر کرد، جو اپنے ساتھ ایک مختصر دواخانہ رکھیں، ایک دیہات سے دوسرے دیہات میں جائیں، اور حسب ضرورت کچھ دن ٹھہر کر بیماروں کا علاج کریں"[۲۳]

قیدیوں کا علاج، شفاخانوں سے فائدہ حاصل کرنے کا دائرہ اس قدر وسیع کیا گیا کہ قیدیوں اور مجرموں کو بھی اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا گیا، چنانچہ ایک فرمان کے ذریعہ وزیر علی بن عیسیٰ نے سنان بن ثابت کو لکھا ہے، کہ

"خدا تمھاری عمر دراز کرے، میں نے قیدیوں کے بارے میں غور کیا، جگہ کی تنگی، اور تعداد کی کثرت کی وجہ سے اکثر قیدیوں کو مختلف قسم کی بیماریاں ہو جاتی ہیں، چونکہ قید میں ہونے کی وجہ سے وہ طبیبوں تک نہیں جا سکتے اور شفاخانوں میں اپنا علاج نہیں کرا سکتے، اس لئے تم ایسے طبیبوں کو مقرر کرو جو روزانہ قید خانوں میں جا کر قیدیوں کو دیکھا کریں، اور بیمار قیدیوں کا علاج کریں"[۲۴]

شفاخانوں کے یہ انتظامات تیسری صدی ہجری ہی میں شروع ہو چکے تھے،

فوجی شفاخانہ فوج کے سپاہیوں کو طبی امداد پہونچانے کی طرف بہت زیادہ توجہ کی جاتی تھی چنانچہ عزیز الدین ابو نصر احمد بن حامد کے بارے میں مذکور ہے کہ اسکی اولیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب وہ مغیث الدنیا والدین محمد کے زمانہ میں افتاء کے منصب پر مامور ہوا، تو اس نے سلطانی لشکر کے لئے ایک خاص شفاخانہ مقرر کیا، جس کا پورا سامان دو سو خچروں[۱۵] اور ایک روایت کے مطابق چالیس اونٹوں پر لد کر لشکر کے ساتھ ساتھ چلتا تھا، عزیز الدین نے طبیب ابو الحکم مغربی کو اس شفاخانے کا انسپکٹر جنرل مقرر کیا تھا،[۵]

ناگہانی حادثوں کے لئے دواخانے، اچانک پیش آنے والے حادثوں کے لئے الگ الگ دواخانے قائم کئے گئے تھے، اس قسم کے دواخانوں کی بنیاد سب سے پہلے مصر کے بادشاہ احمد بن طولون نے ڈالی تھی اس نے جامع طولونی کے بغل میں ایک دواخانہ کھولا تھا جس میں وہ ساری دوائیں تیار رکھی جاتی تھیں، جن کی فوری طور پر ضرورت پڑا کرتی تھی، اور اسکی دیکھ بھال کیلئے ایک شخص مقرر کر دیا تھا، اوسی کے ساتھ ایک طبیب کو متعین کر دیا تھا جو صرف جمعہ کے دن دواخانہ میں بیٹھتا تھا، جب نمازیوں میں سے کوئی اچانک بیمار پڑ جاتا تو اس دواخانہ میں لیجا کر اس کا علاج کیا جاتا تھا،[۸]

شفاخانوں کی عمارتیں، عام شفاخانوں کے لئے بہت سی خوبصورت عمارتیں بنائی گئی تھیں، اور بعض شفاخانوں کی عمارتیں ایسی بھی تھیں، جو پہلے شاہی محل تھے، جن کی حسب ضرورت ترمیم کرکے شفاخانہ بنا دیا گیا تھا،

شفاخانوں کا اہتمام، ان شفاخانوں میں امیر غریب اور چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا، ان کے دروازے سب کے لئے یکساں کھلے تھے، اور سب کیساتھ بہت ہی اچھا برتاؤ کیا جاتا تھا، چنانچہ اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ واقعہ ہے، جسکو ظاہری نے بیان کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ دمشق کا شفاخانہ اس قدر شاندار ہے، کہ کسی دوسری جگہ اس قسم کا شفاخانہ نہیں دیکھا گیا، اس سلسلہ میں ایک عجیب لطیفہ پیش آیا جسکو میں یہاں بیان کرنا چاہتا ہوں،

وہ یہ ہے، کہ میں ۸۳۱ھ ۱۴۲۷ء میں دمشق گیا، میرے ساتھ ایک عجمی فاضل بھی تھا، جو اس سال حج کے ارادہ سے سفر کر رہا تھا، جب دمشق کے شفاخانہ میں داخل ہوا، اور وہاں طرح طرح کی کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھا تو مریض بنگیا، اور شفاخانہ کے مریضوں میں اپنا نام لکھا لیا، شفاخانہ کے افسر الاطباء نے اور مریضوں کی طرح اس کا معائنہ بھی کیا، اور اس کے لئے عمدہ کھانے، مرغ کا گوشت، مٹھائی اور بہترین پھل تجویز کئے، پھر تین دن کے بعد طبیب نے اس شخص کے نام ایک رقعہ لکھا کہ مہمان تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہر سکتا، درحقیقت یہ طبیب کا انتہائی کمال تھا، کہ اس نے بے کہے سنے اس شخص کے اصل مقصد

کوجان لیا کہا جاتا ہے کہ جب سے یہ شفاخانہ تعمیر ہوا ہے، اس وقت سے لے کر اب تک کبھی اس کے چولھے کی آگ نہیں بجھی۔"(۱۴)

شفاخانوں میں ہر مریض کے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا پورا سامان پہلے سے تیار رہتا تھا، مردوں اور عورتوں کے لئے الگ الگ کمرے تھے، مریض جس قسم کا ہوتا تھا، اسی کے مناسب رہنے کے لئے کمرہ دیا جاتا تھا، اور ان میں کھانا پکانے اور دوا تیار کرنے کی جگہیں الگ الگ تھیں

شفاخانوں کے اوقاف ہر ایک شفاخانہ پر بہت سی جائدادیں وقف ہوتی تھیں، اسلئے کبھی روپیہ پیسہ کی کمی نہیں پڑتی تھی، شفاخانوں کے اوقاف پر سخت نگرانی رکھی جاتی تھی، کہ اس کا روپیہ بے محل صرف نہ ہونے پائے، اور مریضوں کے آرام و آسایش کی چیزوں کے مہیا کرنے میں زر کی تنگی نہ ہو،

جب کبھی کوئی ایسا واقعہ پیش آیا، کہ شفاخانوں کی آمدنی غیر مستحقوں پر صرف کیجانے لگی تو فوراً اوس کی اصلاح کی کوشش کی گئی، چنانچہ ثابت بن سنان نے اپنے والد سنان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ شفاخانہ عضدیہ کا افسر تھا، اور اس شفاخانہ پر خلیفہ متوکل علی اللہ کی ماں سجاع نے اپنا کا ایک حصہ وقف کیا تھا، اور دوسرا حصہ بنی ہاشم پر وقف تھا، اس وقف کا نگران ابوصقر وہب بن محمد کلوذانی تھا، جو شفاخانہ سے پہلے وقف کی آمدنی کو بنی ہاشم پر خرچ کرتا تھا، اسکے بعد شفاخانہ کا خیال کرتا تھا، یہ دیکھکر سنان بن ثابت نے وزیر ابوالحسن علی بن عیسی کے نام ایک زوردار خط بھیجا جس میں ابوصقر وہب بن محمد کلوذانی کے طرز عمل کی شکایت کی، وزیر موصوف نے سنان بن ثابت کے خط کے پشت ہی پر ابوالصقر کے نام یہ رقعہ لکھا کہ

"خدا تمھارا مرتبہ بلند کرے، سنان نے تمھارے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ اس خط کی پشت سے معلوم کرلوگے، اور یہ بہت ہی بری بات ہے کہ تم شفاخانے کی طرف سے لاپرواہی کرتے ہو،

اور میں نہیں سمجھتا کہ تم گناہوں سے آلودہ نہیں ہو رہے ہو، بنی ہاشم کے بارے میں تم نے جو کچھ کہا تھا، وہ مجھے یاد ہے، تمھارے لئے یہ کیونکر جائز ہے کہ شفاخانہ کی رقم کے دینے میں کمی کرو، تمھیں چاہئے کہ انصاف اور دیانت سے کام لو، بلکہ میرے نزدیک بنی ہاشم سے شفاخانہ کے مریض تمھاری مدد کے زیادہ مستحق ہیں، اسلئے تم یہ بتاؤ کہ اس جاڑے کے زمانہ میں پے درپے کئی مہینوں تک کیلئے شفاخانہ کی رقم میں کمی کرنے یا اس کے دیر سے دینے میں کونسی مصلحت ہے بہتر ہے کہ تم جلد از جلد شفاخانہ کے بیماروں اور لاچاروں کے لئے کپڑے اور کوئلے مہیا کرو، تاکہ وہ سردی سے اپنے کو محفوظ رکھیں، اور ان کے لئے اچھی غذا، بہترین علاج اور ان کی دیکھ بھال کے لئے خدمتگاروں کو مقرر کرو، میں امید کرتا ہوں کہ تم شفاخانہ کی طرف اچھی طرح توجہ کروگے، اور میرے خط کا اطمینان بخش جواب دوگے"(۳۵)

شفاخانوں کے افسر اعلی، شفاخانہ کے ناظر کا عہدہ بہت بڑا تھا، اور مصر میں یہ منصب عموماً ان امیران کو دیا جاتا تھا، جو صاحب سیف ہوں(۱۹)، اور دمشق میں تو شفاخانہ کا ناظر سلطنت کا نائب ہوتا تھا جو مرتبہ کے لحاظ سے کسی سلطنت و مملکت کا سب سے بڑا عہدہ دار ہوتا ہے(۲۰)

شفاخانوں کے ملازم، شفاخانوں کے بیماروں کی دیکھ بھال کے لئے بہت زیادہ تعداد میں خدمتگار مقرر کئے جاتے تھے، تاکہ ان کو پورا پورا آرام ملے، حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بعض شفاخانوں کیلئے کئی مؤذن مقرر تھے، جو باری باری راتوں میں خدا کی تسبیح نرم اور پرسوز آواز سے پڑھا کرتے تھے، اور ان کا لقب مونس الغربا، یا مونس (المرضی) ہوتا تھا، یعنی یہ کہ ان کی اس آواز سے مریضوں کو تسکین ملتی تھی،(۴)

شفاخانوں کی جائے وقوع، یہ ذکر کے قابل ہے کہ اس قسم کے اکثر ادارے مسجد ہی کے قریب تعمیر کئے جاتے تھے، اور ان کے بغل میں غسلخانہ اور خانقاہیں وغیرہ ہوتی تھیں، اس سے امرا و حکام کا

یہ مقصد تھا کہ نیکی اور اعمال خیر کے تمام ادارے ایک دوسرے کے قریب اور ملے جلے رہیں تاکہ یہ سب ملکر جسم اور روح کے علاج میں کامل یگانگی ظاہر کریں اور تمدنی اور دینی ترقی کے ضامن ہوں،

شفاخانوں میں ماہرین شفاخانہ کے افسر الاطباء کا مرتبہ حکومت کے بڑے منصبداروں سے تھا، ہر شفاخانہ کے لئے ایک افسر الاطباء، کئی طبیب بہت سے جرّاح، کحّال، فصّاد، اور عطّار ہوتے تھے، افسر الاطباء کا کام یہ ہوتا تھا، کہ شفاخانہ کے تمام کاموں کی نگرانی کرے، سارے طبیبوں کا امتحان لے، اور جو امتحان میں کامیاب ہو اسکو ایک خاص دائرہ میں کام کرنے کی اجازت دے،

طب کی سند عربی طب کی تاریخ میں طبابت کی سندوں کا رواج پرانے زمانے سے تھا، لیکن ابتدا سب سے پہلے خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانہ میں ہوئی تھی، اس کی صورت یوں پیش آئی تھی، کہ بغداد میں خلیفہ مقتدر باللہ کے شفاخانہ کے کسی طبیب کی غلطی سے ایک شخص مرگیا، خلیفہ نے اپنے وزیر ابراہیم ابن محمد بن بطحا کو لکھا کہ وہ سارے طبیبوں کو یہ سنادے کہ آیندہ سے وہی شخص بیماروں کا علاج کرسکتا ہے جسکو سنان بن ثابت کی طرف سے کام کرنے کی سند ملی ہو،

چنانچہ خلیفہ کے حکم کے مطابق سارے طبیب سنان بن ثابت کی خدمت میں حاضر ہوئے اس نے ان سب کا امتحان لیا، اور ہر ایک کو اسکی صلاحیت کے مطابق کام کرنے کی اجازت دی، یہ واقعہ ۳۱۵ھ مطابق ۹۲۷ء میں پیش آیا تھا، [۲۶]

اسی قسم کی ایک اور مثال ملک عادل نور الدین زنگی کے زمانہ میں بھی ملتی ہے، کیونکہ اس نے بھی ابن ابی خلیفہ کے ذمہ یہ کام سپرد کیا تھا، کہ وہ کحّالوں کا امتحان لے، اور اس شخص کو آنکھ کے علاج کرنیکی سند دے، جو اسکی صلاحیت رکھتا ہو، [۲۷]

طبی معاینہ شفاخانوں میں بیماروں کا معاینہ اور علاج کا طریقہ یہ تھا کہ ہفتہ کے مقررہ دنوں میں طبیب ایک چبوترہ پر بیٹھ جاتے تھے، اور جب مریض انکے پاس آتے تھے، تو طبیب ان کا معاینہ کرکے نسخہ لکھتے

تھے، اور وہ نسخہ کے مطابق شفاخانہ سے دوائیں لیجاتے تھے، [۲۸]

شفاخانوں میں داخلہ مگر جس شخص کو مستقل طور پر شفاخانہ میں رہ کر علاج کرانے کی ضرورت ہوتی تھی تو اس کا نام شفاخانہ کے رجسٹر میں لکھ لیا جاتا تھا، اس کے بدن کے کپڑے اتار لئے جاتے تھے، اور شفاخانہ کے کپڑے پہنا دیئے جاتے تھے، اور اسکو ایک پلنگ دیدیا جاتا تھا، روزانہ طبیب مریضوں کے پاس آتے تھے، اور دوائیں تجویز کردیتے تھے، تیماردار اور خدمت گار جو پہلے سے مریض کے پاس حاضر رہتے تھے، بغیر کسی تاخیر اور سستی کے شفاخانہ سے دوائیں لادیتے تھے، [۲۹]

مریض کے اچھے ہونے کی پہچان یہ تھی کہ وہ روٹی اور مرغی کے چوزہ کا گوشت ہضم کرسکے، اس وقت اسکو گھر واپس جانے کا حکم دیدیا جاتا تھا، اور کپڑوں کا ایک نیا جوڑا دیا جاتا تھا اور ساتھ ہی کچھ رقم بھی عطا کیجاتی تھی، جو شفاخانہ سے نکلنے کے بعد ایک مدت تک کے خرچ کے لئے کافی ہوتی تھی،

طبی کتبخانے اکثر شفاخانوں میں ایک خاص کمرہ ہوتا تھا جس میں تمام طبی کتابیں موجود ہوتی تھیں بیماروں کے علاج سے فارغ ہوکر افسر الاطباء اور سارے طبیب وہاں بیٹھتے تھے، ان کے ساتھ ان کے شاگرد بھی ہوتے تھے، اور اس روز کے مریضوں، ان کے مرض اور دوا علاج پر بحث اور گفتگو ہوتی تھی، [۳۰] گویا اس لحاظ سے یہ شفاخانے صرف شفاخانے ہی نہ تھے، بلکہ طبی مدرسے بھی تھے، جہاں فن طب کے طلبہ علمی وعملی دونوں قسم کی تعلیم حاصل کرتے تھے،

دمشق کے شفاخانے تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دمشق میں پانچ شفاخانے تھے، ان کے علاوہ وہاں اور بھی بہت سے شفاخانے تھے، مگر تاریخ میں ان کی کوئی تصریح نہیں ہے، وہ پانچ شفاخانے یہ تھے، (۱) شفاخانہ ولید بن عبد الملک (۲) شفاخانہ دقاقیہ (۳) شفاخانہ نوریہ (۴) شفاخانہ قیمریہ (۵) شفاخانہ رکنیہ،

شفاخانہ ولید بن عبد الملک اس شفاخانہ کے آثار آجکل مٹ چکے ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ شفاخانہ

دمشق کے مشرقی دروازہ کے باہر اس عمارت کے قریب جسکو آج اعاطلہ کہا جاتا ہے، واقع تھا اسکی عمارت اینٹوں سے بنائی گئی ہے، مگر اس میں اسقدر چھوٹے اور تنگ جھروکے رکھے گئے ہیں کہ ان میں ہوا کا گذر مشکل ہے، اسلئے یہ عمارت صحت بخش آب وہوا سے بالکل محروم ہے، اپریل ۱۹۳۶ء تک کوڑھی یہیں رکھے جاتے تھے، مگر جب حکمرانوں نے یہ دیکھا کہ یہ عمارت مریضوں کے لئے کسی طرح بھی صحت بخش نہیں، تو انھون نے دمشق کے باہر ایک نئی عمارت بنائی، اور اس میں کوڑھیوں کو منتقل کر دیا گیا، اور اب اعاطلہ کی عمارت بالکل خالی پڑی ہوئی ہے،

اعاطلہ کے جنوب مشرق میں کچھ پرانے نشانات ابھی تک ہیں، ایک دیوار ہے، جسکی لمبائی پندرہ میٹر کے قریب ہے، یہ بڑے اور چوڑے پتھروں سے بنائی گئی ہے، اس میں دو بڑے دروازوں کے برابر کھلا ہوا در ہے، اس در کی نصف اونچائی تک پوری دیوار بالکل بوسیدہ ہو گئی ہے، دیوار کے پورب ایک راستہ ہے، اور اس کے شمال میں ایک میدان ہے، جسکا رقبہ تقریباً ایکہزار مربع میٹر ہے اسی میں سنگ مرمر کے نیچے کھچے موٹے ستون کھڑے ہیں، اس میدان کے اتر طرف ایک وسیع اور کشادہ باغ ہے، یہ بحث ابھی تشنۂ تحقیق ہے کہ یہ اس عمارت کے بچے کھچے آثار ہین، جسکو ولید نے شفاخانہ بنایا تھا، یا یہ کوئی اور عمارت ہے،

شفاخانہ دقاقیہ، اس شفاخانے کے اور بھی بہت سے نام لئے گئے ہیں، جیسے عتیق، قدیم، باب البرید، نوری صغیر، وغیرہ یہ تمام ایک ہی شفاخانہ کے نام ہین، یا مختلف شفاخانون کے؟ کیونکہ دقاق بن تتش جسے اس کا بانی خیال کیا جاتا ہے، پانچویں صدی ہجری کا شخص ہے، لیکن اس شفاخانہ کا ذکر اس سے پیشتر چوتھی صدی ہجری میں ملتا ہے،[10] علموی[م] اور عماد[16] کا خیال ہے کہ یہ عمارت خاندان بنی امیہ کی عمارتوں میں سے ہے، اور اسکو معاویہ بن ابی سفیان یا ان کے لڑکے یزید نے بنایا تھا، مگر انکے بیشتر کے مورخین کے بیانات سے اسکی تصدیق نہیں ہوتی، ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سب سے پہلے

جس شخص نے دمشق میں شفاخانہ بنایا وہ ولید بن عبد الملک تھا،[1] اور یہ ظاہر ہے کہ ولید معاویہ کے بعد پیدا ہوا تھا،

یہ شفاخانہ جامع اموی کے پچھم جانب ایک عجیب و غریب منارہ کے نیچے اور بازار مسکیہ کے جنوب میں تھا، اس کے اور جامع اموی کے درمیان صرف بازار خواقین پڑتا تھا، شفاخانہ دقاقیہ نوین صدی ہجری تک اچھی حالت میں رہا، عماد اور علموی نے لکھا ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے اسکو خراب کیا، اور گھر بنایا، وہ ابو الفضل اخنائی تھا، اس کے بعد اسکا بھائی برہان الدین اخنائی اس کا جانشین ہوا، ان دونوں کے بعد شیخ کمال العجمی نے اس میں سکونت اختیار کی، پھر الیاس کتخدا علی پاشا نے اسکو توڑ کر نئے سرے سے دوسرے نقشہ پر عمارت بنائی،

ابن جبیر اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے:-

"اس دمشق میں دو شفاخانے ہیں، ایک پرانا، اور ایک نیا، پرانا شفاخانہ وہ ہے جو جامع اموی کے پچھم جانب واقع ہے"[11]،

ابن ابی اصیبعہ رشید الدین ابن خلیفہ کے حالات میں لکھتا ہے:-

"جب ملک عادل ابو بکر بن ایوب نے رشید الدین کی قابلیت اور حسن سیرت کا حال سنا تو محرم ۶۱۵ھ میں اسکو بلایا، اور دمشق کے ان دو شفاخانوں کا جس پر ملک عادل نور الدین محمود بن زنگی نے جاگیر وقف کی تھیں نگران مقرر کیا"

عز الدین السویدی کے بارے میں لکھتا ہے کہ

"اس نے باب البرید کے شفاخانہ میں بھی طب کی خدمت انجام دی تھی"[22] (باقی)

سندِ معافی جزیہ

از

سید سلیمان ندوی

ہندوستان کی اسلامی سلطنت میں غیرمسلمان ذمی رعایا سے جزیہ کے نام سے جو ٹیکس وصول ہوتا تھا، اسکی نسبت انگریز مورخوں نے اور انکی دیکھا دیکھی ہندو مصنفوں نے جو بے سروپا باتیں پھیلا رکھی ہیں، انکا جواب بارہا دیا جاچکا ہے، اب ہم کو ایک نئی دستاویز ہاتھ آئی ہے، جس سے یہ معلوم ہوگا کہ یہ کوئی ایسا ٹیکس نہ تھا، جو ظلم سے لگایا جاتا تھا، اور کبھی معاف نہیں ہوتا تھا، بلکہ ایسے لوگوں سے جو غریب ہوتے تھے، عموماً معاف کردیا جاتا تھا، بلکہ ہندوستان کے عام کاشتکاروں سے جو زیادہ تر غریب طبقہ ہے، اکثر معاف کردیا جاتا تھا،

چند سال ہوئے کہ جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب ملی، جس کا نام نگار نامہ ہے اور جس کے مصنف کا نام منشی لال چند ہے، گو تاریخ نہیں معلوم، مگر قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمگیر کے زمانہ یا اُس کے چند دنوں بعد کی تصنیف ہے، اس کتاب کی تالیف کی غرض دفاتر کے منشیوں کو سرکاری فرامین کی تحریر کے نمونوں کی تعلیم ہے، اس میں ایک تحریر کاشتکاروں کی معافی جزیہ کی سند کی نقل ہے، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ یہ کس طرح لکھی جاتی تھی، اور رعایا کو دی جاتی تھی،

سندِ مذکور کی اصل عبارت مع ترجمہ یہ ہے:-

سند جزیہ معافی کشاورزان،

فلان دیوان بالقابہ محفوظ باشد،
چوں دریں ولا بعرض اقدس ارفع رسید کہ
زمینداران کہ کسبِ او از قوتِ او و قوتِ
عیالِ او زیادہ نہ باشد، بموجب دستورِ شرعی
از و جزیہ نباید گرفت، لہٰذا از زمرہ رعایا کہ کسب
زراعت دارند و مدار قوت و تخم
دگاؤ آنہا بر ہمہ فرض است، طلبِ جزیہ
موجبِ تفرقہ آنان میشود اگر مطابق شرعِ
شریف حکم صریح درباب عدم اخذ جزیہ
آں جماعہ صادر گردد بفراغ بال و کسب
و پیشۂ خود کہ آبادیٔ ملک و امانِ رعیت
است مشغول باشند، و از کشادہ سوار
و پیادہ فوجداران و اخذ جزیہ خلاصی
یابند، حکم جہاں مطاع صادر می شود
کہ موافق شرع انور بزارعان بعلت
اخذ جزیہ مزاحم نہ شوند، و از تعلقداران
و چودھریان و قانون گویان و طرف
داران و اہل حرفہ و دیگر ساکن (ساکنین)

کاشتکاروں کے معافی جزیہ کی سند،

فلاں دیوان بالقابہ محفوظ و سلامت رہیں
چونکہ اس وقت بادشاہ سلامت کو
اطلاع دی گئی ہے کہ ان زمینداروں سے
جن کی کمائی ان کی اور ان کے اہل و عیال
کی گذر اوقات سے زیادہ نہیں ہوتی،
اصولِ شریعت کے مطابق جزیہ نہیں لینا
چاہئے، اس لئے غریب اور معمولی رعایا
سے جو زراعت پیشہ ہیں، اور ان کی معاش
بیج اور بیل کا بہم پہونچانا سب پر فرض ہے،
جزیہ مانگنا اون کی پریشان حالی اور انتشار
کا سبب ہوگا، اگر اس گروہ سے جزیہ
لینے کا حکم صریح حسب حکم شریعت صادر
کیا جائے، تو وہ فارغ البالی کے ساتھ
اپنے پیشے میں جو ملک کی ابادی اور رعایا
کے امن و آمان کا سبب ہے، مشغول
رہیں گے، اور پولیس کے سوار اور تحصیل
کے پیادوں سے اور جزیہ سے نجات
پائیں گے، اس لئے بادشاہ سلامت کا

قصبات و قریات مطابق شریعت مطہر

جزیہ باز خواست نمایند، چنانچہ در ین

باب یادداشت واقع درست شدہ و شرح

آن در ضمن رقم یافتہ بنا بر آن قلمی می گردد

کہ آن وزارت پناہ در تعلقہ دیوانی خود

موافق یرلیغ قضا جریان بعمل آرند و بزارعان

بجہت اخذ جزیہ متعرض نہ شوند و معاف

شناسند،

حکم صادر ہوتا ہے، کہ شریعت کے مطابق

کاشتکاروں سے جزیہ لینے کے لئے مزاحمت

نہ کریں، اور تعلقہ داروں، چودھریوں،

قانون گویوں، طرفداروں، اہل پیشہ،

اور قصبات اور دیہات کے دوسرے

باشندوں سے شریعت کے مطابق جزیہ

طلب کریں، چنانچہ اس کے مطابق ایک

یادداشت مرتب کی گئی، اور اسکی تفصیل

اس ضمن میں لکھ دی گئی، اسلئے لکھا جاتا ہو

کہ آپ اپنے دیوانی کے تعلقہ میں اس واجب

العمل فرمان پر عمل کریں اور کاشتکاروں سے

جزیہ لینے کے لئے تعرض نہ کریں اور ان کو معاف سمجھیں

مصحفی کا سالِ وفات

از

قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر پٹنہ،

مصحفی کا سالِ وفات عام طور پر سنہ ۱۲۴۰ھ سمجھا جاتا ہے، آزاد نے صراحۃً یہی لکھا ہے[1] اور بعض اصحاب کے زعم میں شیفتہ کا بھی یہی مطلب ہے، لیکن اس کے متعلق قطعی رائے قائم کرنے سے قبل امورِ ذیل کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے، آزاد مصحفی کی وفات کے بعد پیدا ہوئے ہیں، اور انھوں نے اپنے قول کی کوئی سند بھی پیش نہیں کی، اسلئے اُن کا دعویٰ جب تک اسکی تائید دوسرے ذرائع سے نہ ہو قابلِ قبول نہیں، شیفتہ نے مصحفی کا آخری زمانہ ضرور پایا تھا، لیکن انھوں نے ان کا سالِ وفات اپنے تذکرہ میں نہیں بتایا، صرف اسقدر لکھا ہے کہ "وفاتش را امروز دہ سال گذشتہ"[2] گلشن بے خار کا سالِ آغاز سنہ ۱۲۴۸ھ اور سالِ اختتام سنہ ۱۲۵۰ھ ہے،[3] اسلئے شیفتہ کے قول سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہو کہ سنہ ۱۲۳۸ھ اور سنہ ۱۲۴۰ھ میں سے کسی سال میں مصحفی کی وفات ہوئی، شاید انہی وجوہ سے تذکرہ ہندی مصنفہ مصحفی کے فاضل مرتب نے یہ لکھدیا ہے[4] کہ "وفات کا صحیح سنہ معلوم نہ ہو سکا"، اور افسر امروہی صاحب نے تو سنہ ۱۲۴۰ھ کو قطعاً غلط سمجھ لیا ہے، افسر امروہی صاحب کا دعویٰ ہے کہ مصحفی نے سنہ ۱۲۳۶ھ (سالِ

---

[1] آب حیات طبع نہم ص ۳۱۱، [2] گلشن بے خار مطبوعہ مطبع نولکشور سنہ ۱۹۱۰ء ص ۱۷۰، [3] ایضاً ص ۲ "ابتدائے این کارنامہ در ابتدائے سال ہزار و دو صد و چہل وہشت از ہجرت بودہ، وانتہا در انتہائے ہزار و دو صد و پنجاہ"، [4] مقدمہ تذکرہ ہندی ص ب،

تکمیل ریاض الفصحا (مصنفۂ مصحفی) اور ۲ صفر ۱۲۳۸ھ کے درمیان کسی تاریخ میں انتقال کیا، ان کے دعوے کی بنیاد ذیل کی عبارت ہے، جو تذکرۂ ہندی کے مطبوعہ نسخے کے آخر میں درج ہے:۔

این تصنیف استاد زمانہ بہ عہد خود خاقانی شیخ غلام ہمدانی مرحوم و مصحفی تخلص دارد کتبہ محمد علی بیگ، خاک پائے جلالی بار دوم شہر صفر ۱۲۳۸ھ تمام شد۔"

تذکرے سے اس کا پتہ نہیں چلتا، لیکن یہ عبارت کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور کے قلمی نسخہ سے ماخوذ ہے اور در اصل اسطرح ہے:۔

"این تصنیف استاد زمانہ بہ عہد خود خاقانی ثانی شیخ غلام ہمدانی نام و مصحفی تخلص دارد کتبہ محمد علی بیگ خاک پائے خلایق بہ تاریخ دوم شہر صفر ۱۲۳۸ھ تمام شد۔"

ظاہر ہے کہ اس عبارت سے افسر صاحب کے دعوے کی تائید نہیں ہوتی، اور ۱۲۴۰ھ محض اس کی بنا پر غلط نہیں ٹھہرتا، ذیل میں ہم اور شہادتیں پیش کرتے ہیں، جو ۱۲۴۰ھ کے موافق یا مخالف ہیں، ہماری رائے میں اشرف اور اسیر کے قطعات تاریخ جب موجود ہوں تو ۱۲۴۰ھ کو صحیح سمجھنے میں تامل نہ ہونا چاہئے،

۱- مصحفی کے شاگرد غلام اشرف افسر و اشرف تخلص کے دو قلمی دیوان کتب خانہ مشرقیہ بانکی پور میں موجود ہیں، ایک دیوان میں حسب ذیل قطعہ موجود ہے، جو بظاہر کسی دوسرے شخص کی تصنیف سے ہے:۔

مصحفی چون از جہان رحلت نمود — بستہ نقش جلد ہفتم بر دہم،
گفت صاحب ام تاریخ وفات — مصحف معنی ز دنیا گشت گم، (۱۲۴۰ھ)

دوسرے دیوان میں بھی ایک قطعہ ہے، جو خود مصنف دیوان کا لکھا ہوا ہے، اسکا آخری مصرع یہ ہے:۔

"مصحفی نے سجا مقام بہشت" (سنہ ۱۲۴۰ھ)

۲- مظفر علی اسیر شاگرد مصحفی کے دیوان فارسی میں قطعہ تاریخ وفات ہے، اس سے بھی ۱۲۴۰ھ نکلتا ہے، یہ دیوان طبع ہو چکا ہے اور ابھی حال میں ہماری نظر سے گذرا ہے، لیکن اسوقت ہماری دسترس سے باہر ہے، اسلئے قطعہ تاریخ نقل نہیں کیا جا سکتا،

۳- مصحفی نے ریاض الفصحا[1] میں ناصر شاگرد مذنب کا حال لکھا ہے، ناصر اپنے تذکرے میں لکھتا ہے:

"اس جہان گذران سے داغ بے قدری اپنے دل پر لے گیا، کسی شاگرد نے تاریخ اس کے وفات کی یہ کہی: ع

"کہ آتش بمصحف حرام آمدہ"

کسی ظریف نے اس پر یہ اعتراض کیا:۔

ندانست آن کس کہ گفت این سخن — کہ آتش بمصحف حرام آمدہ،
بعہد خلیفہ چو آتش زدند، — در احراق مصحف تمام آمدہ،

پورے مصرعے سے ۱۲۴۵ھ نکلتا ہے، اگر "کہ" کے ۲۵ قاعدے کے مطابق نکال دئے جائیں تو ۱۲۲۰ھ مستخرج ہوگا، اور اگر بمصحف کو "بہ مصحف" لکھیں، تو ۱۲۲۰ھ میں ۵ کا اور اضافہ ہوگا، ناصر نے صرف ایک مصرع نقل کیا ہے، قبل کے مصرع میں غالباً ۵ کا تخرجہ کیا ہوگا،

۴- کریم الدین نے اپنی تاریخ شعرائے اردو میں سال وفات ۱۲۲۰ھ لکھا ہے[2]، یہ صریحاً غلط ہے، اور غلطی غالباً کاتب کی ہے مصنف کی نہیں، اسلئے کہ گلشن بیخار کریم الدین کے ماخذوں میں ہے، اور اس کے مطالعے کے بعد تیرہویں صدی کے عشرۂ چہارم سے قبل مصحفی کا سال وفات قرار نہیں دیا جا سکتا،

[1] ص ۳۲۴، [2] ص ۳۵۰،

تلخیص و تبصرہ

ہندوستانی زبان کے متعلق چند غلط فہمیاں

(بسلسلہ گذشتہ)

از ڈاکٹر تاراچند صاحب سکریٹری ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد

ہندی کی عمر ۱۳۵ سال۔ حال کے بعض ہندی اہل قلم نے جدید ہندی کی ابتدا کے متعلق اس بیان کے خلاف احتجاج کیا ہے، لیکن جہاں تک میں دیکھتا ہوں اُن کا احتجاج زیادہ وزن نہیں رکھتا، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ اگر جدید ہندی (سنسکرت نما ہندوستانی) کی اصل اور نشو و نما کا مطالعہ بے لاگ طریقہ پر کیا جائے، تو اس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے یعنی یہ کہ یہ زبان صرف (۱۳۵) سال پرانی ہے، بلکہ شاید اتنی بھی نہیں، کیونکہ اگرچہ سدل مسرا، اور للولال جدید ہندی کے طلوعِ صبح کے نقیب تھے، تاہم یہ صبح صبح کاذب ثابت ہوئی، اسلئے کہ ہندی پر تاریکی پھر چھاگئی، اور یہ تاریکی کہیں ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ہم شیو پرشاد، راجہ لکشمن سنگھ، بابو ہرِیش چندر اور بعض دوسرے حضرات کے ہاتھوں ہمیشہ کیلئے دور ہوئی اور پھر جدید ہندی لٹریچر کی صبح صادق نمودار ہوئی، غلط فہمیوں سے بچنے کے لئے میں حسب ذیل امور پیش کرنا چاہتا ہوں، جو میرے خیال میں ہماری زبان کے ہر سائنٹفک طالب علم کے نزدیک صحیح ہونگے

۱- مگہی جو جدید ہندی آریائی زبانوں کی ایک مشرقی شاخ ہے، اسکے لٹریچر کا آغاز آٹھویں صدی سے ہوتا ہے، جیسا کہ راہولا سنکرتیایانا (Rahula Sankrityayana) نے دکھایا ہے،

۲- راجستھانی جو اسی خاندان کی ایک مغربی شاخ ہے، بارہویں صدی سے لیکر انیسویں صدی تک اپنا ایک وافر لٹریچر رکھتی تھی، لیکن اب وہ ایک ادبی زبان کی حیثیت سے باقی نہیں رہی،

۳- برج بھاشا بھی اسی خاندان کی ایک مغربی شاخ ہے، یہ بطور ایک ادبی زبان کے پندرہویں صدی سے لیکر انیسویں صدی تک رائج رہی، جدید ہندی کے آغاز کے بعد اس کا استعمال نثر میں موقوف ہوگیا، اور شاعری میں بھی اب یہ روز بروز کم استعمال ہورہی ہے،

۴- اودھی جو ایک مشرقی شاخ ہے، پندرہویں صدی میں نمایاں ہوئی لیکن اسے برج بھاشا کی سی مقبولیت کبھی حاصل نہ ہوئی، اب یہ ادبی زبان نہیں سمجھی جاتی،

۵- مغربی اور مشرقی ہندی کی دوسری شاخیں بھی چودہویں صدی سے انیسویں صدی تک ادب میں استعمال ہوتی تھیں لیکن اُن میں سے کسی کی ادبی حیثیت اب باقی نہیں رہی،

۶- کھڑی بولی یا ہندوستانی کی دو ادبی شکلیں ہیں، اسکی ابتدائی شکل جسے اس کے استعمال کرنے والے ہندی کہتے تھے، اور جو اب اردو کہی جاتی ہے، چودہویں صدی سے لیکر اسوقت تک اپنی مسلسل تاریخ رکھتی ہے، دوسری شکل جدید ہندی کے نام سے مشہور ہے، ادب میں اس کا استعمال انیسویں صدی کی ابتدا میں شروع ہوا، اور اس زبان نے غدر کے بعد سے بہت ترقی کرلی ہے،

ہندی اردو اور ہندوستانی۔ تیسری غلط فہمی ہندی، اردو اور ہندوستانی کے باہمی تعلق کی نسبت پھیلی ہوئی ہے، اس امر میں کسی کو شبہہ نہ ہونا چاہئے، کہ یہ تینوں نام ایک ہی زبان کے ہیں، زبانوں کا رشتہ متعین کرنے کے لئے ضروری ہے، کہ انکی ہیئت صوتی ہیئت ترکیبی، اور فرہنگِ الفاظ کا باہمی موازنہ کیا جائے، ان تین عناصر میں سے پہلے دو خاص اہمیت رکھتے ہیں، تیسرے کی اہمیت معمولی ہے، جن لوگوں نے لسانیات پر کتابیں لکھی ہیں، اُن سب کی بالاتفاق یہ رائے ہے کہ کسی زبان کی نحوی ساخت اسکا سب سے زیادہ پائدار اور مستقل جزو ہوتی ہے، جو نسلاً بعد نسل اپنے تمام ارتقائی تغیرات میں

بدستور قائم رہتی ہے، نظام صوتی نظام نحوی کا سا مستقل نہیں ہوتا، پھر بھی اس میں ایک قسم کی پائداری ہوتی ہے لیکن فرہنگ الفاظ میں تو عجیب و غریب تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں،

مائے، (A. meillet) جو موجودہ لوگوں میں لسانیات کا ایک نہایت بلند فاضل ہے، کہتا ہے: "تلفظ اور صرف و نحو کے قاعدے مستقل ہیں، ان میں سے ہر قاعدہ کے تمام حلقے ایک سلسلہ کی کڑیوں کی طرح باہم ملے ہوئے ہیں، صوتی اور صرفی قاعدے اجنبی چیزیں قبول نہیں کرتے، لیکن اس کے الفاظ کوئی نظام یا قاعدہ نہیں رکھتے، ہر لفظ گویا اپنا ایک منفرد وجود رکھتا ہے،..... لسانی تعلقات کو واضح کرنے والی زبان کے بولنے کی بہیم خواہش کا سب سے زیادہ اصرار بہ اعتبار زبان کے تلفظ اور صرف و نحو کی پابندی سے ہوتا ہے"

لہٰذا اگرچہ فارسی زبان میں عربی الفاظ کی کثرت ہے تاہم وہ ایک آریائی زبان ہے، اسی طرح لاطینی عناصر کی کثرت کے باوجود انگریزی اب بھی ایک ٹیوٹانک (Teutonic) ہی زبان ہے، یہی صورت سندھی اور پنجابی کی ہے، ان زبانوں نے فارسی اور عربی کے بہت سے الفاظ اپنے اندر لے لئے ہیں تاہم ان کے صوتی اور صرفی قاعدے صاف ظاہر کرتے ہیں، کہ وہ ہندی آریائی زبانیں ہیں،

فرہنگِ الفاظ کا مدار تاریخ کی تلوّن مزاجی پر ہے جس کی تازہ ترین مثال جنگ عظیم میں ملتی ہے، انگلستان میں امراء کے خاندانوں کے جرمن نام ترک کر دیے گئے، اور ان کے بجائے انگریزی نام رکھے گئے، مثلاً خاندان ہینوور (Hanover) کا نام خاندان ونڈزر (Windsor) ہوگیا، فرانسیسی زبان جو غیر زبانوں کے الفاظ کو بہت مشکل سے قبول کرتی ہے، اس نے بھی بہت سے انگریزی الفاظ اخذ کرلئے، مثلاً جنٹلمین (Gentlman) اسپورٹ (Sport) وغیرہ، روسیوں نے اپنے شہروں کے ناموں سے جرمن لاحقہ "برگ" (Burg) کو خارج کرکے

ان کے بجائے سلافی لاحقہ گراڈ (grad) شامل کر دیا، چنانچہ سینٹ پٹرس برگ (سنٹ petersburg) پٹروگراڈ (Petrograd) ہوگیا، اور پھر جب پیٹر کے خاندان کا زوال ہوا تو پٹروگراڈ بدل کر لینن گراڈ (Leningrad) کر دیا گیا، تاریخی اسباب، قومی محبت یا عداوت، اور دوسرے معاشرتی حالات سے لغات پر برابر اثر پڑتا رہتا ہے،

ان اصولوں کی روشنی میں ہم کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں؟ ہندی، اردو، اور ہندوستانی کا صوتی نظام ایک ہی ہے، ہر ایک میں آواز کی تین قسموں یعنی (۱) قدیم ہندی آریائی حروف علت و حروف صحیح (۲) جدید ہندی آریائی حروف علت و حروف صحیح، اور (۳) سامی آوازوں کی تعداد یکساں ہے، اس واقعہ کو کسی قدر بادل ناخواستہ اہل قواعد نے بھی تسلیم کیا ہے، مثلاً پنڈت کامتا پرشاد گرو نے اپنی "ہندی ویاکرن" میں ڈاکٹر دھیریندر ورما نے "ہندی بھاشا کا اتہاس" میں اور مولوی عبدالحق نے اپنی قواعد اردو میں صوتی نظام کی رو سے ہندی، اردو، اور ہندوستانی ایک ہی زبانیں ہیں، لیکن دوسری آریائی اور سامی زبانوں مثلاً سنسکرت، برج بھاشا، اودھی، فارسی، اور عربی سے مختلف ہیں،

پھر ان تینوں کی صرف و نحو بھی کم و بیش یکساں ہے، گریرسن کہتا ہے: "اردو اور ہندی میں جو تصریفیں اور حروفِ عطف مستعمل ہیں اُن میں کوئی اہم فرق نہیں ہے، میری رائے میں اردو اور ہندی کو دو مختلف زبانیں قرار دینا اس مسئلہ نیز پورے علم لسانیات سے متعلق ایک بنیادی غلط فہمی کو ظاہر کرتا ہے"

جہاں تک فرہنگ الفاظ کا تعلق ہے، یہ یکسانی پوری نہیں ہے، زبان میں تین قسم کے الفاظ ہوتے ہیں: "اصلی اور دیسی الفاظ جو بول چال میں رائج ہوتے ہیں، وہ الفاظ جو دوسری زبانوں سے لے لئے جاتے ہیں، اور مرکب اور مشتق الفاظ، اردو اور ہندی میں پہلی قسم کے الفاظ

کثرت سے رائج ہیں، مثلاً تقریباً تمام افعال، ضمائر، حروف عطف، حروف جر اور حرف ندا، جہانتک

اسما، اور صفات کا تعلق ہے، دونوں نے دیسی الفاظ کے علاوہ سنسکرت، پراکرت، فارسی، عربی، اور

دوسری زبانوں سے بھی اخذ کیا ہے، غیر زبانوں سے جو الفاظ لئے گئے ہیں، ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں کیونکہ

ایسی فرہنگیں جو خالص سائنٹفک اصولوں پر مرتب کی گئی ہوں، موجود نہیں ہیں، مولوی

سید احمد دہلوی مشہور مرتب "فرہنگ آصفیہ" نے اپنے جمع کئے ہوئے الفاظ کا تجزیہ کیا ہے، کل پچاس ہزار

الفاظ ہیں، ان میں سے (۷۵۸۴) عربی سے لئے گئے ہیں (۶۰۴۱) فارسی سے (۵۵۴) سنسکرت سے

(۵۰۰) انگریزی سے اور (۱۸۱) دوسری زبانوں سے، باقی دیسی الفاظ ہیں، اگر ہم ہندی سبد ساگر

کی ورق گردانی کریں، جو ناگری پرچارنی سبھا کے زیر نگرانی مرتب ہوئی ہے، تو ہم دیکھیں گے کہ اس

ہندی لغت میں تقریباً وہ تمام (۷۵۸۴) عربی اور (۶۰۴۱) فارسی الفاظ شامل ہیں، یہ اس بات کی

کھلی ہوئی دلیل ہے، کہ جو الفاظ دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں، اُن کے لحاظ سے بھی ہندی اردو

کے درمیان اتنا زیادہ فرق نہیں ہے، جتنا بعض لوگ خیال کرتے ہیں، جہاں تک مرکب اور مشتق الفاظ

کا تعلق ہے، ترکیب کے طریقے اور مشتق الفاظ کے بنانے میں اضافتوں کے قاعدے بھی بڑی حد تک مشترک

ہیں، جیسا کہ دونوں زبانوں کی صرف و نحو سے معلوم ہوتا ہے،

سنسکرت نما ہندی کی موافقت میں دلیلیں، — ہندی اور اردو الفاظ کی یکسانی کو دکھلانے کیساتھ اس حقیقت پر نظر رکھنا بھی ضروری

ہے، کہ ان دونوں زبانوں میں جو اختلافات ہیں، وہ کافی بڑے ہیں، اور اگر

ان کی روک تھام نہ کی گئی، تو وہ ترقی کرتے جائیں گے، ہندی اور اردو اہل قلم کی دو جماعتیں ہیں

ایک جماعت کا خیال یہ ہے، کہ قدیم زبانوں کے الفاظ کثرت سے اخذ کئے جائیں، دوسرا گروہ ان

الفاظ کو ایک محدود تعداد میں لینا چاہتا ہے، ہر فریق یکساں دلیلیں پیش کرتا ہے، مثلاً پہلی جماعت

کے ہندی مصنفین سنسکرت تتسم (مصادر) کو کثرت سے استعمال کرنے اور عربی فارسی الفاظ کو ترک کرنے

کے لئے مندرجہ ذیل دلیلیں پیش کرتے ہیں:-

(الف) ہندی ایک آریائی بولی ہے، جو دوسری ہندی آریائی بولیوں مثلاً بنگالی، مرہٹی،

اور گجراتی سے قریبی تعلقات رکھتی ہے، ان بولیوں کے لئے اپنی مشترک مادری زبان یعنی سنسکرت سے

اخذ کرنا ایک قدرتی چیز ہے، جتنا ہی زیادہ سنسکرت تتسم (مصادر) اصطلاحی الفاظ میں استعمال کئے

جائیں گے، اتنا ہی زیادہ یہ بولیاں ایک دوسرے سے قریب ہوتی جائیں گی، اور ان کے بولنے

والوں کے لئے ہندی کا سمجھنا آسان ہوتا جائے گا، اس طرح ہندی کو ہندوستان کے صوبوں کی

ایک مشترک زبان بننے کا موقع ملجائے گا،

(ب) الفاظ اپنے ساتھ ایک تمدنی (کلچرل) ماحول رکھتے ہیں، سنسکرت الفاظ کیساتھ قدیم

ہندوستانی تمدن کا ماحول بھی وابستہ ہے، برخلاف اسکے عربی فارسی الفاظ کیساتھ ایک غیر ملکی نسبت

اور تعلق ہے، لہذا ایک ہندوستانی زبان کے لئے پہلی قسم کے الفاظ قابل ترجیح ہیں،

عربی فارسی الفاظ کو مفرس کرنے کی موافقت میں دلیلیں — جو لوگ غیر ملکی الفاظ کو عربی سے لینے کے حامی ہیں، ان کی دلیلیں

بھی اسی قسم کی ہیں، وہ کہتے ہیں، کہ عربی ایک بڑے فرقہ کی مقدس کتابوں کی زبان ہے، اور

اپنے اندر ایسی روایات رکھتی ہی جو اس فرقہ کے نزدیک محبوب ہیں، علاوہ اس کے عربی ایک زندہ

زبان ہے، جو تیزی کیساتھ مغربی علوم و فنون کو اخذ کرتی جا رہی ہے، اور اس بنا پر علوم جدیدہ کے

اصطلاحی الفاظ کے لئے ایک موزوں ماخذ ہوگی؛ اسے ہندوستان کے ہر حصہ میں مذہبی لوگ کثرت

سے پڑھتے ہیں، اور لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس کے لہجہ اور فقروں سے مانوس ہے، یہ ہندوستانی

یا کھڑی بولی پر مسلسل اثر ڈالتی رہی ہے، جسکی شہادت صوتی اور نحوی قاعدوں اور فرہنگ الفاظ

سے ملتی ہے، زمانہ سابق میں برج بھاشا اور اودھی کے بڑے بڑے مصنفین مثلاً سورداس اور تلسی داس

نے اپنے گیتوں اور نظموں میں عربی الفاظ بے تکلف استعمال کئے ہیں، واقعہ یہ ہے، کہ ایسے ہزاروں

الفاظ ہندوستانی زبان میں شامل ہوگئے ہیں، جنکی شہادت "ہندی سبد ساگر" سے ملتی ہے،

دلیلوں کی تحقیق: ان دلیلوں پر نہایت احتیاط سے غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ ان مخالف رایوں کے درمیان میں جو راہ ہے، وہی سب سے زیادہ دانشمندی کی راہ ہے، ہندوستانی کو سنسکرت نما بنانے کی مخالفت نہ صرف بیمز اور گریرسن جیسے ممتاز یوروپین ماہر لسانیات نے کی ہے، بلکہ بعض ہندوستانی فاضل مثلاً راجہ شیو پرشاد، پنڈت بال کرشن بھٹ، پنڈت گردھر شرما، پنڈت پدما سنگھ شرما، اور پنڈت ایودھیا سنگھ اپادھیا بھی اس کے مخالف ہیں، میں یہاں صرف پنڈت گردھر شرما کی رائے نقل کرتا ہوں وہ کہتے ہیں: "سنسکرت نما بنا کر آپنے بنگال اور مہاراشٹر وغیرہ میں ہندی کی اشاعت جلد کرلی لیکن وہ محض تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان بن کر رہ گئی، عوام اسے بالکل نہ سمجھ سکے، پھر کیا فائدہ ہوا؟ فائدہ کیا نقصان ہوا...... ہندی زبان میں ہندی زبان ہی کے الفاظ پہلے لینے چاہئیں، پھر جب اُن سے ضرورت پوری نہ ہو، اسوقت سنسکرت زبان سے آسان الفاظ لینے چاہئیں"

دوسری طرف سید علی بلگرامی، مولوی وحید الدین سلیم، اور مولوی عبدالحق جیسے اہل علم حضرات نے ان لوگون کے جوش کو معتدل کرنے کی کوشش کی ہے، جو کثرت سے عربی الفاظ استعمال کرنا چاہتے ہیں، مولوی وحید الدین صاحب اپنی کتاب وضع اصطلاحات میں لکھتے ہیں:-

"ہم کو اس دھوکے سے بچنا چاہئے، اور ہندی زبان کے الفاظ و حروف سے جو ہماری زبان کی فطرت میں داخل ہیں ناک بھوں چڑھانا نہیں چاہئے ہم جس طرح عربی فارسی سے اصطلاحات لیتے ہیں، اسی طرح ہندی سے بھی بے تکلف وضع اصطلاحات میں کام لینا چاہئے"

بدقسمتی سے یہ جماعتیں ایک دوسرے سے بے تعلق رہ کر کام کرتی رہی ہین، اس لئے ان کے مشورہ اور تنبیہ پر لوگون نے کوئی توجہ نہیں کی نتیجہ یہ ہے کہ ہندی اور اردو تیزی کیساتھ اہل علم کی زبان بنتی جارہی ہیں، اور عوام کی زبان سے دور پڑتی جاتی ہین بجائے اس کے کہ ان کے ذریعہ سے لوگ

ایک دوسرے کا مفہوم سمجھتے یہ زبانیں ہمسایوں کے درمیان لسانی اجنبیت پیدا کررہی ہین ان کے فائدہ کا دائرہ تنگ ہوتا جارہا ہے، اور ان کی مقبولیت کم ہوتی جارہی ہے،

تمدنی مناسبت: اس میں شبہ نہیں کہ تمدنی مناسبت پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا، ہر تمدن (کلچر) کا تعلق روحانیات، اخلاقیات، معاشرت، اور جمالیات سے ہے، اس طرح تمدن طبیعی اور نفسیاتی موثرات سے متاثر ہوتا ہے، چنانچہ کلچر یا تو ملکی ہوتا ہے، مثلاً فرانسیسی، انگریزی، چینی اور ایرانی، یا طبقاتی جیسے امرا، متوسط طبقہ، اور عوام کا کلچر، ہم ہندوستانی کلچر کا ذکر کرتے ہیں، لیکن کیا ہندی اور اردو کلچر کے بھی کوئی معنی ہیں؟ اردو (مفرس ہندوستانی) زمانہ سابق میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات کی اشاعت کے لئے استعمال کی گئی ہے، اور آج بھی اس مقصد کے لئے استعمال کی جارہی ہے، اور توقع ہے کہ آیندہ بھی استعمال کیجائے گی، اسی طرح ہندی (سنسکرت نما ہندوستانی) نے مسلمانوں کی خدمت کی ہے، اور ایسا کیوں نہ ہو؟ اگر چینی، ایرانی، پشتو، جاوی، اودھی، بنگالی، اور بہت سی دوسری زبانیں جنکو عربی سے کوئی تعلق نہیں ہے مسلمانوں کی مذہبی تحریروں اور تقریروں میں استعمال کیجاسکتی ہیں، تو ہندوستانی میں سنسکرت الفاظ کی ایک تعداد کو داخل کرلینے سے مذہب کیوں تباہ و برباد ہوجائے گا؟

ہندوستانی کلچر حال کی پیداوار ہے، جسکی تعمیر میں اس وسیع ملک کا ہر فرقہ حصہ لے رہا ہے، سچائی اور قدر و قیمت کا جو نصب العین اس کے سامنے ہے، وہ ایک قومی حیثیت رکھتا ہے، اور صوبوں نسلوں اور فرقوں کی تقسیم سے بالاتر ہے، اس کلچر کی تشکیل جن طبیعی اور معاشرتی حالات میں ہورہی ہے، وہ سابق حالات سے مختلف ہیں، اور ہماری اندرونی اور بیرونی جدوجہد بھی اب پہلی سی نہیں ہے، ضرورت ہے کہ ایک مشترک کلچر کے اس احساس کا اثر ہندوستان کی ادبیات پر روز بروز زیادہ پڑتا جائے خواہ یہ ادبیات ٹامل، تیلگو، بنگالی، گجراتی، مرہٹی، یا ہندوستانی میں ہوں،

پس ہمیں ہندی اور اردو کے تمدنی ماحول کے اختلاف پر حد سے زیادہ زور نہ دینا چاہئے

برخلاف اس کے ہمیں چاہئے کہ اُس پالیسی کے عملی نتائج پر غور کریں، جسکے اثر سے مندرجہ ذیل قسم کی اصطلاحات وضع کیجاتی ہیں :۔

انگریزی :۔ 1. Abscissa, 2. Absolute term, 3. Accelerate, 4. Algebra, 5 Alternando, 6. Antecedent

ہندی :۔ (۱) بھج (۲) پرم بد، (۳) گتی وریدھی کرنا، (۴) بجگنت (۵) ایکانتر نشپتی، (۶) پروایا،

اردو :۔ (۱) فاصلہ یا مقطع (۲) رقم مطلق (۳) اسراع حرکت (۴) جبر و مقابلہ (۵) تبدیل (۶) مقدم،

عملی دشواریاں میں نے ان کو اصطلاحات کی اُن فرہنگوں سے لیا ہے، جو ناگری پرچارنی سبھا بنارس، اور انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع ہوئی ہیں، یہ نمونہ ہیں الجبرا کی اصطلاحات کا، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اختیار کرکے ہندوستانی زبان کی دو شکلوں کے درمیان کتنی وسیع خلیج تیار کیجا رہی ہے، جب تک ہندوستانی نوجوانوں کی تعلیم کا ذریعہ انگریزی زبان تھی، اسکی فکر نہیں ہوئی، کہ ہندوستانی زبان کی مصطلحات ایک ہی زبان میں ہیں، یا دو میں لیکن اب جبکہ ثانوی درجہ تک تعلیم ہماری ہی زبان میں دیجا رہی ہے، اور وہ وقت جلد آنے والا ہے جب اعلیٰ تعلیم بھی دیسی زبان میں دیجائیگی، مصطلحات کے دو زبانوں میں ہونے کا سوال بہت اہم ہو جاتا ہے خصوصًا بنگال کے علاوہ شمالی ہند کے اور حصوں میں جہاں اردو اور ہندی کے حامی مل جل کر رہتے ہیں، اگر طلبہ اردو اور ہندی کو نہ سمجھ سکیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلیم دونوں زبانوں میں دینی پڑے گی، جس سے خواہ مخواہ یا تو قابلیت میں کمی پیدا ہو جائیگی، یا اخراجات بڑھ جائیں گے یونیورسٹیوں میں یہ دشواریاں اور بھی زیادہ بڑھ جائیں گی، علم تحقیق، اور معلومات کی اشاعت کا

مسئلہ بہت پیچیدہ ہوجائیگا، کیا ہر یونیورسٹی میں اساتذہ کی دو جماعتیں ہونگی ایک اردو اور دوسری ہندی کیلئے یا کیا ہر مرکز میں دو یونیورسٹیاں ہوں گی؟

پھر سوال یہ ہے کہ قانون ساز مجلسوں اور حکومت کی زبان کیا ہوگی؟ پنجاب میں یہ مسئلہ آج زیر بحث ہے اور جلد صوبجات متحدہ، بہار، اور آخر میں دہلی میں بھی ہمیں اس پر غور کرنا پڑیگا، اور پھر ریڈیو، سنیما، مختلف صوبوں کی باہمی تجارت، اور آپس کے تعلقات کا سوال ہے، ہندوستان کی کونسی زبان انگریزی زبان کی قائم مقام ہوگی؟ کیونکہ میں سمجھتا ہوں، ہم سب اس پر متفق ہیں کہ آیندہ انگریزی زبان سے ان مقاصد کا حاصل ہونا ممکن نہیں ہے، بڑے افسوس کی بات ہے کہ محض غیر زبانوں کے الفاظ کی بنا پر ہم ایک ہی زبان کی دو شکلوں کو ایک دوسرے سے دور ہونے دے رہے ہیں، اور اسطرح تعلیمی اور انتظامی مسائل کو زیادہ دشوار بنائے چلے جاتے ہیں،

ہندوستانی کے لئے عذر ہندوستانی جیسا کہ میں نے اوپر دکھانے کی کوشش کی ہے کوئی مصنوعی زبان نہیں ہے، ایک مستقل زبان کی حیثیت سے ہزار برس سے قائم ہے، اس کا ایک وافر لٹریچر ہے، میں ان تمام تصنیفات کو جو دکن میں نظم یا نثر میں ہوئی ہیں، ہندوستانی ہی کا ایک جزو سمجھتا ہوں، شمال میں بھی باوجود اُن لوگوں کی کوششوں کے جنھوں نے غیر ملکی مثالوں کی پیروی کی ہے بہت کچھ شاعری آسان اور عام بول چال کی زبان میں ہے، اسکی مثالیں ہر عہد کے دیوانوں میں مل سکتی ہیں، حالی کی "مناجات بیوہ" اور "برکھا رت" ایسی اردو کی بہترین مثالیں ہیں، جو اپنے جذبات اور زبان دونوں کے اعتبار سے تمام تر ہندوستانی ہے، جدید ہندی میں بھی مثالیں موجود ہیں، کہ ہندوستانی کس طرح لکھنی چاہئے، میں صرف ایک مصنف کا نام لینے پر قناعت کرونگا، لیکن وہ ایسا ہے کہ بحیثیت ایک تخلیقی مصنف کے جدید ہندی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتا، یعنی منشی پریم چند،

واقعہ یہ ہے کہ جہانتک ادبی زبان کا تعلق ہے، جدید ہندی اور اردو محض دو طرز ہیں ہندوستانی کے، اور سائنٹفک تصنیفوں میں انکا اختلاف صرف غیر زبانوں کے الفاظ تک محدود ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس اختلاف کو دور کرنا ناممکن نہیں ہے بشرطیکہ ایسا کرنیکا عزم موجود ہو، ذاتی طور پر میرا خیال یہ ہے کہ اسکے ضروری ہونے میں

کوئی شبہ نہیں اور جو لوگ اس خلیج کو پُر کرنے کے خواہشمند ہیں انکے ملاحظہ کیلئے میں حسب ذیل تجویزیں پیش کرنی چاہتا ہوں،

۱- ایسی تدبیریں اختیار کرنی جائیں جس سے اردو بولنے والے جدید ہندی سیکھیں اور ہندی بولنے والے اردو سیکھیں،

۲- جو الفاظ اردو اور ہندی کے مستند مصنفین نے استعمال کئے ہیں انکی ایک فرہنگ مرتب کیجائے،

۳- جدید طرز پر ایک قواعد تیار کیجائے جسمیں اردو اور ہندی کے صوتی اور صرفی قاعدوں کی تشریح ہو اور الفاظ کو ملانے اور مشتق کرنے کے اصول واضح طور پر بیان کئے جائیں،

۴- ہندی اور اردو مصنفین کے لئے مصطلحات کی ایک فرہنگ مرتب کیجائے،

۵- ترجمہ کرنے والوں کے لئے ایک انگریزی ہندوستانی ڈکشنری تیار کیجائے،

۶- نظم و نثر کا ایک منتخب مجموعہ مرتب کیا جائے، جو آسان اردو اور ہندی میں ہو،

ان تجویزوں میں سے بعض پر تو افراد یا انجمنوں کے ذریعہ عمل درآمد ہو سکتا ہے لیکن بعض ایسی ہیں کہ ان کے لئے حکومت کی مدد درکار ہو گی، مثلاً ہندی اردو کی تعلیم کو فروغ دینا اسکولوں میں محکمہ تعلیم ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، اسی طرح مصطلحات کی کوئی فرہنگ مرتب نہیں ہو سکتی جب تک اردو ہندی زبانوں کے فاضل باہم متفق نہ ہوں اور یہ فاضل انہی علاقوں کے ہوں جہاں یہ زبانیں بولی جاتی ہیں، اس مسئلہ کا تعلق متعدد صوبوں سے اور ریاستوں کی تعلیمی ترقی سے ہے، لہذا انکی حکومتوں کی مدد کے بغیر کامیابی کیساتھ اُسے حل کرنا مشکل ہو گا، چونکہ یہاں کوئی مستند انجمن فرانس کی اکاڈمی جیسی نہیں ہے اسلئے مناسب ہے کہ حکومتوں، یونیورسٹیوں، اور ادبی اور سائنٹفک انجمنوں کے نمایندوں کی ایک کمیٹی قائم کیجائے جو مشترک مصطلحات کے مسئلہ پر غور کرے، اور اس کا کوئی مستند حل تجویز کرے،

اگر سائنٹفک اور اصطلاحی الفاظ کے مسئلہ پر باہم اتفاق ہو جائے تو پھر ہندی اردو کے جھگڑے کی جڑ کٹ جائے، ایک ہی علاقہ میں دو زبانوں کی موجودگی سے جو دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں وہ دور ہو جائیں گی، اور بول چال اور لٹریچر دونوں میں ہندی، اردو مل کر ایک زبان کی شکل اختیار کرنے لگیں،

"ع ز"

اخبار علمیہ

موسیقی کے حیرت انگیز اثرات

موسیقی کے اثرات پر جو تحقیقات دنیا کے بڑے بڑے تجربہ خانوں، ہسپتالوں، جیل خانوں، اور دماغی شفاخانوں میں ہو رہی ہے، یعنی موسیقی سے ہماری جسمانی اور دماغی صحت پر کیا اثرات پڑتے ہیں، وہ حد درجہ حیرت انگیز ہیں، مثلاً ابھی حال میں ایک روسی سائنسدان پروفیسر کرادکو (V. K. Kravkov) نے یہ معلوم کیا ہے کہ موسیقی اور اسی قسم کی آوازوں سے سننے والے کی آنکھ کی روشنی و بینائی میں پچیس فی صدی کا اضافہ ہو سکتا ہے، تجربہ سے معلوم ہوا کہ گھڑی کے چلنے کی آواز اگرچہ ایک بہت معمولی چیز ہے، تاہم اس کی ہم آہنگی سے بھی آنکھ کی روشنی میں تیزی پیدا ہوتی ہے، روسی پروفیسر کا بیان ہے، کہ توقع کیجاتی ہے، کہ اس دریافت کا ایک عملی فائدہ یہ ہو گا کہ اس سے ہیئت دانوں، خوردبین سے دیکھنے والوں، قلم کاروں، اور دوسرے لوگوں کو جنکے کام کا مدار ان کی آنکھوں کی قوت اور صحت پر ہے، مدد ملے گی، اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز وہ تجربات ہیں جو امریکہ میں کیے جا رہے ہیں، ابھی تھوڑے دن ہوئے شکاگو کے ایک پاگلوں کے شفاخانے میں ایک پاگل عورت پر پیانو کے گانے کا عجیب و غریب تجربہ کیا گیا، وہ ایک بچہ کی ماں تھی، لیکن اسکی دماغی حالت اسقدر خراب تھی، کہ اپنے بچہ کو دیکھنے سے انکار کر دیتی تھی، اور کہتی تھی کہ اس کے ساتھ جانور کا سا سلوک کیا جائے وہ اٹلی کی رہنے والی تھی، بوگس لانسکی (Boguslawski) نے جو ایک مشہور پیانو

بجانے والا ہے، اس عورت کے سامنے چند اطالوی گیت پیانو پر گانا شروع کئے، شروع میں تو عورت پر کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا، لیکن رفتہ رفتہ اسکی حالت بدلنے لگی، اور آخر میں وہ رونے لگی، اور اس نے لوگوں سے درخواست کی، کہ میرے بچہ کو میرے پاس لاؤ، اسی قسم کا ایک دوسرا مستند واقعہ بیان کیا گیا ہے، کہ ایک عورت کو اتفاقیہ طور پر یہ معلوم گیا، کہ بعض قسم کے گانوں سے اس کے مرگی کے دورے قابو میں آجاتے ہیں، ایک مرتبہ جب اس نے محسوس کیا، کہ دورہ آنے والا ہے، تو اس کے ایک دوست نے پیانو بجانا شروع کیا، اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی، کہ اس کے بعد دورہ بڑھا نہیں اب جب کبھی اسے دورے کی آمد محسوس ہوتی ہے، تو وہ گانے کی ایک "خوراک" استعمال کر لیتی ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ پھر کبھی شدید دورہ نہیں پڑتا،

دماغی علاج کرنے والے سرجن، دندان ساز، اور دوسرے ماہرین، موسیقی سے عجیب و غریب کام لے رہے ہیں، ڈاکٹر ال ایس بنڈر (Dr. L. S. Bender.) کا جو نیویارک کے ایک اسپتال میں کام کرتے ہیں، بیان ہے کہ بعض بچے جن کی دماغی حالت خراب تھی، موسیقی کے ذریعہ سے تندرست ہوگئے، دندان سازوں نے بھی موسیقی کے ذریعہ دانت نکالنے کے خوف کو دور کر دیا ہے، ایک مریض نے تو یہاں تک کہا کہ مخدرات (Anisthetics) کا استعمال روک دیا، اور اس کے بجائے خود ہارمونیم بجانے لگا، اور اس میں اس قدر محو ہو گیا، کہ اس کی ران سے ڈاکٹر بندوق کی گولی نکالتے رہے، اور اسے تکلیف محسوس نہیں ہوئی،

اس امر میں اختلاف ہے کہ موسیقی کا اثر ہم پر ٹھیک کس طریقہ سے پڑتا ہے، بعض ماہرین کا خیال ہے کہ آواز کے ارتعاش سے جسم پر براہ راست اثر پڑتا ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ اثر صرف اعصاب اور جذبات کے ذریعہ سے پڑتا ہے، مشہور اور ممتاز سرجن ڈاکٹر کرائل (Dr. George W. Crile) کا خیال ہے، کہ بہت سی بیماریاں جذبات پر بہت زیادہ بار پڑنے

مثلاً تردّدات، خوف یا شدید برانگیختگی سے پیدا ہوتی ہیں، انکی رائے ہے کہ موسیقی اس عصبی کشیدگی میں نرمی پیدا کر دیتی ہے، اور اس طرح مریض کے صحتیاب ہونے میں مدد دیتی ہے،

خطرناک مجرموں اور مجنونوں پر بھی موسیقی کے مفید اثرات کے تجربے ہو رہے ہیں، امریکہ کے ایک پاگل خانہ میں (Willian van de wall) ایک مشہور ماہر موسیقی گیا، ایک پاگل نے اس کا آلہ موسیقی لے کر خود اس پر گانا شروع کر دیا، اسکی آواز بہت اچھی تھی، تجربہ سے معلوم ہوا کہ اگر ہفتہ میں ایک بار بھی اسے گانے کی اجازت دیدی جائے، تو اس سے اسکے دماغ پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند مہینوں کے اندر وہ اس وارڈ سے جہاں خطرناک قسم کے پاگل رکھے جاتے تھے نکالدیا گیا، اور پھر کچھ دنوں کے بعد اسکو دماغی ہسپتال ہی سے نکال دیا گیا، کیونکہ موسیقی کے ذریعہ سے اسکی دماغی صحت بالکل درست ہوگئی،

صنعت و حرفت میں بھی موسیقی سے مدد لی جا رہی ہے، یہ دیکھا گیا ہے کہ جب تک گانا ہوتا رہتا ہے، مزدوروں کے کام کی رفتار تیز ہو جاتی ہے، حال میں لندن کے ایک کارخانہ میں تجربہ کیا گیا، کہ جب تک ایک فونوگراف بجتا رہا، (۳۵۵) مزدوروں کے کام کی مقدار گیارہ فی صدی بڑھ گئی،

سانپوں پر گانے کا جو اثر ہوتا ہے، وہ عام طور پر سب کو معلوم ہے، درندوں پر بھی گانے کا خاص اثر ہوتا ہے، مثلاً ایک چیتے کے بچہ کو گراموفون کا گانا سنا کر رام کیا گیا، سب سے زیادہ دلچسپ تجربہ امریکہ میں مرغیوں پر ہوا ہے، بیان کیا جاتا ہے، کہ گانا سننے سے وہ زیادہ انڈے دینے لگیں، اس سے معلوم ہوا کہ موسیقی سے انڈا دینے کی قوت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے،

یوم رورک

۱۰ اکتوبر ۱۹۲۷ء کو پروفیسر نکولس ڈی رورک (Nicholas de Roerich) کے آرٹسٹک، لٹریری، اور سائنٹفک کارناموں کی پچاسویں سالگرہ منائی جائیگی، اس روسی آرٹسٹ کا شمار دنیا کے ممتاز ترین آرٹسٹوں میں ہے، اس نے مصوری کے چار ہزار شاہکار پیش کئے ہیں جنمیں سے ایک ہزار نیویارک کے رورک میوزیم میں اور باقی دنیا کے بیس دوسرے ملکوں کے بڑے بڑے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں، اس کے کارنامے ایک ماہر آثار قدیمہ، ایک سائنٹسٹ، ایک فلسفی، اور تحریک اتحاد بین الاقوامی کے ایک لیڈر کی حیثیت سے بھی کم نمایاں نہیں ہیں، اخوت انسانی کو اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار دے رکھا ہے اور اسی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتا ہے، دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں نے اسکی قدرات کا اعتراف کیا ہے، پیرس، بلگریڈ، بنارس، زگریب، (یوگوسلاویا) ریگا، بیونس ایرز، کیوٹو اور بریگ میں اسکی تصویروں کے لئے مخصوص ایوان قائم ہو گئے ہیں، رورک نے اب ہندوستان سے اپنا مستقل تعلق پیدا کر لیا ہے، اور پنجاب میں نگر کے مقام پر جو وادی کولو میں واقع ہے، ارسوتی ہمالین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (Urusvati Himalyan Research Institute) قائم کر کے وہیں بود و باش اختیار کر لی ہے، اس انسٹی ٹیوٹ میں آثار قدیمہ، لسانیات اور تجربی سائنسوں کے متعلق ریسرچ ہوتا ہے، جہاں تک کہ انکا تعلق ہندوستان اور وسط ایشیا کے علاقوں سے ہے، رورک کو ہندوستان سے بہت محبت ہے، اور وہ یہاں کی قدیم تہذیب و تمدن کا بڑا مداح ہے، رورک کی مصوری میں ایسے موضوع بھی شامل ہیں جنکا تعلق گذشتہ یا موجودہ حالات اور واقعات سے ہے، اور ایسے بھی جن کا تعلق آیندہ کی پیشین گوئی سے ہے وہ اپنی تصویروں کا موضوع مشرق سے بھی حاصل کرتا ہے اور مغرب سے بھی، لیکن ہمالیہ کی جو تصویریں اس نے کھینچی ہیں، ان کا کوئی نظیر نہیں،

"ع ز"

مطبوعات جدیدہ

فصل الخطاب مولفہ مولینا اکبر خان صاحب نجیب آبادی تقطیع بڑی ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ غیر مجلد ۱۲؍ پتہ مکتبہ عبرت نجیب آباد یوپی

اس دور تجدید و اصلاح کا ایک بڑا فتنہ مذہبی تعلیمات کی غلط تعبیریں اور تاویلیں ہیں، اس کے جواب میں مولینا اکبر خانصاحب نے یہ کتاب تالیف فرمائی ہے، اس میں دکھایا ہے کہ مسلمانوں کی دینی سعادت اور دنیوی فلاح کا نسخہ اور ان کے لئے دائمی نظام العمل صرف کلام اللہ ہے، اور اس کے بنیادی مسائل اتباع ہدایت، اس سے انکار، مذہب، قانون سازی کا استحقاق، کتاب اللہ کا درجہ اور اس کا مقصد نبیوں اور رسولوں کی ضرورت، خدا، اور رسول کی اطاعت، خدا، اور آخرت پر ایمان، مومن اور دنیا پرست اور الٰہی اور غیر الٰہی حکومت کا فرق، اسلامی نصب العین وغیرہ پر قرآنی آیات سے روشنی ڈالی گئی ہے، ان بحثوں کا مرکز خدا اور رسول کی اطاعت کی تاکید، اور اولی الامر کی اطاعت کی تحدید اور تشریح ہے، یعنی اسلام میں خدا کے علاوہ کسی دوسرے کی اطاعت نہیں اور رسول کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے، اولی الامر کی اطاعت صرف ایک خاص حد تک ہے، جس کے بعد وہ دین کے دائرہ سے خارج ہو جاتی ہے، ان کے علاوہ اور بہت سی مفید ضمنی بحثیں ہیں، جا بجا تاریخ سے بھی وضاحت کی گئی ہے، اور ان سب کا مدار قرآنی احکام پر ہے، اگرچہ بعض بعض بحثوں سے استدلال محل نظر ہے لیکن یہ کتاب ان فتنوں کا اچھا جواب ہے، جو غیر محسوس طور سے مذہب کے نام سے پھیلائے جا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس دینی خدمت کو قبول فرمائے،

نزل الثوی فی اجوبۃ الترمذی، (حصّہ اول) (عربی زبان میں) مؤلفہ مولینا محمد اصغر حسین صاحب نائب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، تقطیع چھوٹی ۱۵۱ صفحے کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی، قیمت عہ، پتہ اصلاحیہ بک ڈپو پیر بھوڑ مہندرو پٹنہ، و حافظ عبد الحلیم صاحب بہاری متعلم شمس الہدیٰ پٹنہ،

صحاح ستہ کی مشہور کتاب "ترمذی" تقریباً ہر عربی مدرسہ کے نصاب میں داخل ہے اور اختلافی مسائل کے لحاظ سے اس کا درس نہایت معرکۃ الآرا ہوتا ہے، جملہ مذہبی علوم میں حدیث کا درس سب سے زیادہ مشکل ہے، ایک مسئلہ پر حدیث کی مختلف کتابوں کی روایتوں کا استقصا، ان کی توضیح و تشریح، راویوں پر ردّ و قدح، صرفی و نحوی اور لغوی مشکلات کا حل، متعارض حدیثوں کی تطبیق، ان سے ائمۂ اربعہ کے مسلک کی تائید و تردید، اور اس قبیل کے بہت سے مشکلات ہیں، مولینا اصغر حسین صاحب نے اس کتاب میں ترمذی کے کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوٰۃ کے ابواب کے جملہ مشکلات کو سوال و جواب کی صورت میں نہایت خوبی کے ساتھ حل کیا ہے، اور مذاہب اربعہ کے مختلف فیہ مسائل میں مختلف حدیث کی کتابوں کی روایتوں کی چھان بین اور انکی تحقیق و تنقید کرکے حنفی مسلک کا اثبات کیا ہے، یہ کتاب حدیث کے طلبہ کے لئے خصوصیت کیساتھ زیادہ مفید ہے،

رفیق الصلوٰۃ (حصّہ اوّل و دوم سوم) مؤلفہ مولینا محمد رفیق صاحب دہلوی، تقطیع بڑی ضخامت ۳۲، ۴۴، اور ۲۰ صفحات کاغذ، کتابت و طباعت نہایت معمولی، قیمت حصّہ دوم و سوم ۸ر اور ۴ر، پتہ حوض قاضی حویلی رجنہ بیگم، دہلی،

یہ تینوں رسالے مولینا محمد رفیق صاحب نائب صدر جمعیۃ تبلیغ الصلوٰۃ دہلی نے تالیف فرمائے ہیں، پہلے رسالہ میں ایمان کے ارکان، کلمات، ایمان مفصل، ایمان مجمل، اور وضو، غسل اور تیمم کے تفصیلی مسائل ہیں، دوسرے میں کلام اللہ اور احادیث نبوی سے نماز کی اہمیت اور اس کے فضائل پر روشنی

ڈالی گئی ہے، اور نماز پنجگانہ اور جمعہ کے احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں جہانتک ممکن ہو ان مسائل میں قرآن اور حدیث سے مدد لی گئی ہے، تیسرے حصّہ میں چارون مذاہب کے اختلافی مسائل، رفع یدین، آمین بالجہر، قرأت خلف الامام، اور وضع الیدین تحت السرہ اور فوق السرۃ میں احادیث سے احناف کا مسلک ثابت کیا گیا ہے، تینون رسائل ابتدائی مذہبی تعلیم کے لئے مفید ہین،

اسوۂ حسنہ رسول کریم، مؤلفہ جناب بھونبیشری سہائے عرف بھولا بابو وکیل بیگو سرائے ضلع مونگیر، تقطیع بڑی ضخامت ۸۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۸ر مصنف سے ملیگی،

یہ کتاب ذات پاک نبوی اور اسلام کے ساتھ ایک خوش عقیدہ ہندو کی سچی عقیدت کا نتیجہ ہے، اس میں کچھ سیرۃ پاک، کچھ اسوۂ حسنہ کے واقعات، عام مذہب، نبیوں اور رسولوں کی ضرورت، قرآن، نماز اور روزے کے فضائل، اسلام کی رواداری، رہبانیت اور تناسخ کی تردید، اسلامی توحید اور اسکے اثرات وغیرہ آنحضرت صلعم اور اسلام کے متعلق بہت سے متفرق اور مفید معلومات جمع کئے گئے ہیں اسلامی رواداری کے سلسلے میں ہندوستان کے بعض مسلمانون بادشاہوں کی رواداری کے واقعات بھی آگئے ہیں، گو اس میں بعض غیر معتبر روایتیں بھی شامل ہوگئی ہیں، پھر بھی اس حیثیت سے کہ یہ کتاب ایک غیر مسلم کا ہدیۂ عقیدت ہے، ہر طرح تعریف اور قدر کا مستحق ہے،

اسلامی طب، مؤلفہ جناب ابن مظہر معین الدین رہبر صاحب فاروقی، منشی فاضل تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ معمولی کتابت وطباعت اچھی قیمت مجلد علاوہ محصول ڈاک ۱۲ر، بے جلد عہ، پتہ سن برج ہاؤس عابد بلڈنگ مصطفیٰ بازار حیدرآباد،

مسلمانون نے غیر قوموں کے جن علوم کو کمال کے درجہ تک پہنچایا، ان میں طب خاص طور سے قابل ذکر ہے انھون نے اسکو اتنی وسعت اور ترقی دی کہ یونانی طب کو اسلامی طب بنالیا، اسلامی حکومتوں نے اسکی بڑی سرپرستی کی، ہر قوم کے طبیبون کو درباروں میں جگہ دی، طب کی کتابون

کے ترجمے کرائے مستقل کتابیں تالیف کرائیں، شفاخانے اور طب کی درسگاہیں قائم کیں، اس ذوق

اور سرپرستی سے مسلمانوں میں بڑے باکمال اور صاحب تصنیف اطبا پیدا ہوئے جنھوں نے طب کو

آسمان تک پہونچا دیا، "اسلامی طب" اسکی مختصر اور اجمالی سرگذشت ہے، اس میں تمام بڑی بڑی

حکومتوں کے طبی خدمات ان کے زمانہ کے بڑے بڑے طبیبوں کے حالات، ان کے کمالات اور

کا ذکر ہے، یہ موضوع اتنا وسیع ہے، کہ اس مختصر کتاب میں اس کا احاطہ مشکل ہے، پھر بھی لائق مؤلف

کی یہ ابتدائی کوشش قدر کے لائق ہے، ہمکو اس کے ذریعہ سے بہت سی ایسی نادر کتابوں کے وجود

کا علم ہوا جن کے صرف نام معلوم تھے، امید ہے کہ لائق مؤلف آیندہ اس موضوع کو اس سے زیادہ

اور استقصار کیساتھ پیش کرینگے،

المۂ تلبیس، مؤلفہ جناب مولوی ابو القاسم صاحب رفیق دلاوری تقطیع بڑی ضخامت

۵۳۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت عہ، علاوہ محصولڈاک پتہ منیجر دار التصنیف

نمبر ۱۰ فلیمنگ روڈ لاہور،

اسلامی تاریخ میں عہد رسالت سے اسوقت تک بہت سی مجنونوں، اسلام کے دشمنوں اور سیاسی

حوصلہ مندوں نے خدائی، نبوت، مجددیت اور مہدویت کے دعوے کئے بعضوں کو عارضی فروغ بھی

لیکن پھر ان کے مذاہب آپ اپنی موت مرگئے بعضوں کی رسی ابتک دراز ہے، مولوی ابو القاسم صاحب

نے ان تمام دجالوں کی پوری تاریخ لکھدی ہے، ہم نے اس کتاب کو جابجا سے دیکھا، مفید دلچسپ اور

پڑھنے کے لائق ہے، لیکن سرسری نظر میں بعض نہایت فاش غلطیاں نظر آئیں، مصنف نے محض مہدویت

کے دعوے کی بناپر بعض جلیل القدر ہستیوں کو بھی گمراہ دجالوں میں شامل کرلیا ہے، مثلاً محمد بن تومرت

مغربی مہدی سوڈانی، اہلبیت نبوی کے بعض بزرگ جنھوں نے محض حکومت وقت کے مقابلہ میں کسی نوع

کی مہدویت کا دعوی کیا تھا، حالانکہ ان میں سے کسی کے عقیدے میں کوئی فتور نہ تھا، بلکہ نہایت

متقی و پرہیزگار تھے، اسی طرح فاطمی خلفار کے نسب کے متعلق ان کا قطعی فیصلہ بہت کچھ غور طلب ہے،

ان کی جانب جو خیالات منسوب ہیں، وہ بڑی حد تک ان کے گمراہ داعیوں کے پھیلائے ہوئے ہیں،

اور کسی حد تک سیاسی اسباب کا نتیجہ ہیں،

انقلاب فرانس، مصنفہ باری تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۰ صفحے، کاغذ کتابت و

طباعت اوسط، قیمت مرقوم نہیں، پتہ اردو بک اسٹال بیرون لاہوری دروازہ لاہور،

یہ رسالہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، انقلاب فرانس کی مختصر تاریخ ہے، ابتدا میں ایک

مقدمہ ہے جس میں یورپ کی نشأۃ ثانیہ اور تاریخ فرانس کے مختصر حالات ہیں، اس کے بعد انقلاب فرانس

کے اسباب، حکومت اور امرار کا ظلم و استبداد، مصنفین اور مصلحین کی تصانیف سے خیالات میں انقلاب،

ذہنی بغاوت، عملی اقدام، انقلاب، ملوکیت کا خاتمہ، تمام مدارج کو مختصراً دکھایا گیا ہے، انداز بیان

دلچسپ ہے، لیکن غیر معمولی اختصار اور خطیبانہ انداز بیان کی وجہ سے بعض بعض مقامات پر بغیر پہلے سے واقفیت

کے حالات کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے،

بیاض سخن مرتبہ جناب عبد الشکور صاحب شیدا، تقطیع بڑی ضخامت ۲۴۶ صفحے کاغذ اچھا،

کتابت وطباعت معمولی، قیمت عہ، حالی عار کلدار علاوہ محصول، پتہ محمد نسیم احمد صاحب صدیقی،

نائب محاسب عدالت عالیہ، حیدرآباد دکن و عبد الشکور صاحب شیدا اسب رجسٹرار بگولی دکن

یہ بیاض جناب عبد الشکور صاحب شیدا کے ذوق سخن کی قلمی یادداشت تھی، جسکو انھوں نے بیاض

سخن کے نام سے شائع کیا ہے، اسے صحیح معنوں میں "کشکول شاعری" کہنا چاہئے، اسلئے کہ اس میں کچھ

تذکرہ کی بھی جھلک ہے، بعض بعض شعرار کے برائے نام حالات دیدیئے گئے ہیں، انتخاب میں عموماً دور

کی ترتیب کا لحاظ ہے، ہر دور کے بڑے صاحب سلسلہ شعرار کے پورے سلسلہ کے شاعروں کا انتخاب

ایک سلسلہ میں ہے، اس میں مولینا حسرت موہانی کے اردوے معلّیٰ سے زیادہ استفادہ معلوم ہوتا ہے،

جو شعرا کسی خاص سلسلہ میں نہیں ہیں، ان کے کلام کا انتخاب علحدہ ہے، پھر اصل مرکز یعنی دہلی اور لکھنؤ کے شعرا کے بعد ان کے نواح کے شعرا کا انتخاب ہے، آخر میں چند خواتین شعرا، یورپین شعرا، ان شعرا اور مجہول شعرا کے کلام کا انتخاب اور مختلف شعرا کے ہم قافیہ اشعار ہیں، اور کچھ ہندی کلام ہے، یہ بیاض اس حیثیت سے نہایت جامع ہے کہ اس میں اردو شاعری کے ابتدائی دور، بلکہ اس سے بھی پہلے کے نمونوں سے لیکر موجودہ زمانوں تک کے ۴۳۰ مشہور اور غیر مشہور شعرا کے کلام کا انتخاب جمع کر دیا گیا ہے، لیکن ترتیب اور واقعات میں بعض فرو گذاشتیں ہیں، ترتیب کی فرو گذاشت چنداں لائق توجہ نہیں کہ دراصل یہ بیاض ہے، شاعری کی تاریخ نہیں، واقعات کی غلطی یہ ہے کہ مرتب نے شاد عظیم آبادی، نواب امداد امام اثر، مولینا محمد علی جوہر، مولانا شبلی کو نواحِ لکھنؤ کے شعرا میں اور کوکب شاہجہاں پوری، ہادی مچھلی شہری، سر اقبال، آسی مدراسی، حفیظ جالندھری، اور امجد حیدر آبادی کو نواحِ دہلی کے شعرا میں شمار کیا ہے، جو مختلف وجوہ سے غلط ہے، انتخاب میں ہر شخص کا ذوق جداگانہ ہوتا ہی، تاہم مرتب نے مختلف رنگ و مذاق کے کئی ہزار اشعار جمع کر دئیے ہیں، جو ایک جگہ مشکل سے مل سکتے ہیں،

انتخاب کلام مطہر، مصنفہ جناب ڈاکٹر عبد الغفور صاحب مطہر مرحوم تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۹۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ محمد احسن الغفور بی اے علیگ ڈپٹی انسپکٹر مدارس اسلامیہ حلقۂ دوم آگرہ،

ڈاکٹر عبد الغفور صاحب مطہر مرحوم گذشتہ دور کی یادگار میں تھے، پرانے گلدستوں میں انکا کلام نظر آتا ہے، انکے فرزند رشید محمد احسن الغفور صاحب نے انکے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے، نثر کے چند مضامین بھی ہیں، نظم و نثر دونوں اس دور کی پرانی خصوصیات کی حامل ہیں، زبان میں صحت و صفائی کا بڑا اہتمام ہے، نثر محاورات و مصطلحات، اور شوخی تحریر سے بھری ہے، ایک پرانی یادگار کی حیثیت سے یہ انتخاب لائق قدر ہے،

"م"